سید ابوالاعلیٰ مودودی
تنقیحات
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

فہرست مضامین

ہے۔ اس کا ہر

قصدی ربط

یا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۷ رجون ۱۹۳۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

اس مجموعہ میں وہ چھوٹے چھوٹے مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں جو میں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے، اور غلط فہمیوں میں اُلجھے ہوئے حقائق کی تنقیح بھی۔ جو علمی اور عملی مسائل آج کل شب و روز پیدا ہو رہے ہیں، ان کو حل کرنے کے لیے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ لوگ ان کو صحیح روشنی میں دیکھیں اور خود ان کی اپنی بصیرت رنگین نہ رہے۔ اس لیے ادارۂ دارالاسلام کے علمی شعبہ کی جانب سے یہ مجموعہ ابتدا ہی میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ خیالات کے صاف کرنے میں اس سے مدد لی جا سکے۔

اس مجموعہ کو ایک مسلسل اور مربوط کتاب کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کا ہر مضمون بجائے خود مستقل ہے، البتہ ان مختلف مضامین میں ایک مقصدی ربط ضرور پایا جاتا ہے اور اسی ربط کے لحاظ سے انہیں ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ (۲۷ جون ۱۹۳۹ء)

ہماری ذہنی غلامی اور اُس کے اسباب

حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آتیں، اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جاتیں، ذہنیتیں اسی کے سانچے میں ڈھلیں، تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو، اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جاتا ہے اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جاتی ہے جس کو وہ باطل ٹھہراتے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جاتی ہے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی و معاشی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائلِ ثروت پر قابض اور ان کے نظمِ مملکت پر حاوی ہو جاتے۔ اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجئے جو اوپر غلبہ کی دو قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی اور تحقیق و

اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لیے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لیے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں اور طاقت در۔ ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقتور۔ قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمراں ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آجکل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسم کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی انجمنیں، ان کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب

اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے، کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا حال یہ ہے تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا حال کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلاء کی بنا در اصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اسے مقلد و تبع بننا پڑتا ہے۔ اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے طاقتور افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو بہا لے جاتا ہے اور ان میں اتنا بل بوتا نہیں رہتا کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہ جائیں۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے

رہے تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوعِ انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں اربابِ فکر اور اصحابِ تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انہوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، جب وہ اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفیٰ دے دیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس میں آگے بڑھیں۔ انہوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا، کائنات کے راز ٹٹولے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کئے، اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتہً مغربی اقتدار کا سیلاب اُٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے ماتے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی مگر نہ قلم کا زور تھا نہ تلوار کا۔ شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوادِ اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت

رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آتے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے، اس نئے اور طاقتور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں، اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ

پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہو گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر، اور ان کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے، مگر سوء اتفاق سے نشاۃ جدیدہ (Rennaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک رونما ہوئی، تو اس تحریک کو ان عیسائی پادریوں سے سابقہ پیش آیا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔ اس غلط تخیل کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لیے قوت سے کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کے علمبرداروں کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی اس لیے تشدد سے دبنے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریتِ فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتداء میں لڑائی حریتِ فکر کے علمبرداروں اور کلیسا کے درمیان تھی مگر چونکہ کلیسا مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہا تھا، اس لیے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحی مذہب اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار

کرلی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مدمقابل قرار دیا گیا۔ سائنٹفک طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پاتے کہ یہ طریق فکر مذہبی طرز فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص سائنٹفک طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالم طبیعت (Physical World) کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا اس لیے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی فوق الطبیعت (Super natural) ہستی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور ہر اس طریقہ کو خلافِ حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائلِ کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہلِ حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح یا روحانیت اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبرّی نہ کرتے تھے کہ دلائل اور براہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا، بلکہ اس سے اس لیے بیزار تھے کہ وہ ان کے اور ان کی آزادیِ خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ کارفرما رہا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ ان کا رُخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چونکہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے

ہوتے تھے اس لیے وہ ابتداءً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہتے رہے۔ مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو، ان سے بالکل غائب ہو گیا اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ و حرکت کے سوا کوئی شے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی، سائنس نیچریت کا ہم معنی قرار پا گیا اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو ناپی اور تولی نہیں جا سکتی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes) (متوفی ۱۶۵۰ء) جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے، اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالم طبیعت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنیاد رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (Hobbes) (م ۱۶۷۹ء) اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر فوق الطبیعت (Super natural) کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو مگر، اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں سپائنوزا (Spinoza) (م ۱۶۷۷ء) اٹھا جو سترھویں صدی میں عقلیت (Rationalism)

کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا اور اس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنیز (Leibnitz) (م ۱۷۱۶ء) اور لاک (Locke) (م ۱۷۰۴ء) خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترھویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، اسی طرح سائنس نے بھی سترھویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنیکس (Copernic us) کیپلر (Kepler) گیلیلو (Galileo) نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے جو اس نظام کو چلا رہی ہیں اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہشمند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور نیچریت کا تخم تھا جو بعد میں حریتِ فکر کے درخت سے پیدا ہوئی۔ لیکن سترھویں صدی کے حکماء کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریقِ فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظامِ کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland) ڈیوڈ ہارٹلے (David Hartley) جوزف پریسٹلے (Iosoph priestley) والٹیر (Voltaire) میٹری (La Mettrie) ہول باخ (Holbach)

کیبانیس (Cabanis) ڈینس ڈایڈیرو (Denis Diderot) مانٹسکیو (Móntisque) اور روسو (Rosseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ و حکما پیدا ہوئے جنہوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرمان روا (Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی جو نظام کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہو گیا ہے اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عالم طبیعت، اور دنیائے مادہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ہیوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empiricism) اور فلسفۂ تشکیک (Scepticism) سے اس طریقِ فکر کی زبردست تائید کی اور معقولات کی صحت کے لیے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے (Berkeley) نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رَو کا جان توڑ مقابلہ کیا مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (Hegal) نے مادیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا مگر ٹھوس مادے کے مقابلہ میں طبیعت تصور کی پرستش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی یہ راہ نکالی کہ خدا کی ہستی، روح کا بقا، اور ارادہ کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں مانی نہیں جاسکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے اور حکمتِ عملی (Practical Wisdom) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن

ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل وفکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل اور بے اختیار ہستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لیے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا، اور اس کی خوشنودی چاہنا سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی، فوگت (Vogt) برخنر (Buchner) سوبلے (Czolbe) کومت (Comte) مولشات (Moleschotte) اور دوسرے حکماء و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مِل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیت اور اخلاق میں افادیت (Utiliterianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظامِ کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہو جانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات (Physiology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے، کوئی اس کو چلانے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کر رہی ہے، کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کہیں باہر سے نہیں پڑتی، بلکہ خود مادہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور، فکر، سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔

حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ (Free will) نہیں ہے، ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، ان کی انرجی کا خرچ ہو جانا ہی ان کی موت ہے جو فنائے محض کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لیے حشر اور بار دگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اس نیچریت اور مادیت کو استحکام بخشنے اور ایک مدلل اور منظم علمی نظریہ کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) جو ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹیفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے، آثار و مظاہر فطرت کے لیے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں، زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لے کر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقا ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواع حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے بلکہ وہی ایک جاندار مشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی، تنازع للبقا، بقائے اصلح اور انتخاب طبیعی کے نتیجہ کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس

میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیاتِ دنیا کے اعمال پر محاسبے کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بُن سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادہ پرستی الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرقِ اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلا سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے ان کے

لئے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب داب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیر حکم آگئیں تھیں۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑتے اور چونکہ یہ تحصیل علم خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھی اور مزید براں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی پیدا نہ ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروغ میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی

تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلا سے قطع نظر، مغرب کا علمی اور فکری داب و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیئے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہلِ فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃ جدید (Rennaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب الٹے پاؤں اِن منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے۔ ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب

جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصد و مدعا کو تمثیل کے پیرایہ میں یوں سمجھئے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں جو لوگ اس میں بیٹھے ہوتے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رُخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں یا بائیں پھیر دے۔ مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوتے ہیں اور فکر اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لیے گاڑی اپنے مسافروں کو لیے ہوتے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزلِ مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اٹھیں اور جدوجہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہو گا گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا اور ہمارے جھنجھلانے بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس

پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ۔ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدرِ اوّل کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصولِ غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے وہ طلبِ دنیا کے بجائے طلبِ آخرت کے نشہ میں سرشار تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باجگذار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انہیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا اس کے سوادِ اعظم کو ملتِ حنیفی میں جذب کر لیا علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیب اسلامی کے علمبردار اور علومِ اسلامی کے معلم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدرِ اوّل کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جب کہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے ان ممالک میں کلیتہً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کر لی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدرِ اوّل میں اس ملک کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصہ

پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے، ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصل سلسلہ شروع ہوا تو فاتحوں میں صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے یہاں اشاعتِ اسلام کے بجائے توسیعِ مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں اور لوگوں سے اطاعتِ خدا و رسول کے بجائے اپنی اطاعت اور باج گزاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرماں روائی کے بعد بھی ہندوستان کا سوادِ اعظم غیر مسلم رہا، یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا، نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے، اور خود باہر کے آتے ہوتے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہلِ ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانہ میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بجائے خود ضعیف تھا اور محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سوادِ اعظم پر چھایا ہوا رہا اور ہندوستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں

کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد قضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی کا زمانہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان اُس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے جس پر انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کئے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیئے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں، اور جن کے ہاتھوں "محمڈن لا" روز بروز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی

کی بدولت اس قوم کو مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق، اور ذلیل و خوار کرکے چھوڑ گیا۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی۔ اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو بھی توڑ دیا۔ ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کر دیں، ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا، اور ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور ان کا اپنا سرمایہ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سببِ ذلت اور موجبِ نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے۔

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام عیوب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیئے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے

اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو

انہیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ مرحوم سرسید احمد خاں کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اُٹھی جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انہوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے۔ قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلمی کے کام آئے، اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیئے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیت انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکی تھی۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہو کر نئے نظریئے قائم ہو چکے تھے۔ یورپ میں ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی جس کی بنیاد کلیتہً انہی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے، کلی طور پر خارج کر ہی دیا تھا، البتہ تخیل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد

کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی، سواب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی اگرچہ علوم حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریہ کے خلاف کوئی ثبوت (جس کو ثبوت کہا جا سکتا ہو) بہم نہیں پہنچایا تھا مگر اہل حکمت بغیر کسی دلیل کے محض اپنے رجحانِ طبیعت کی بنا پر خدا سے بیزار اور الٰہی نظریہ کے دشمن تھے اور چونکہ انہی کو اس وقت دنیا کی عقلی و علمی امامت کا منصب حاصل تھا اس لیے ان کے اثر سے خدا سے بیزاری (Theophobia) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا۔ وجود باری کا انکار، کائنات کو آپ سے آپ پیدا ہونے والی اور آپ سے آپ قوانینِ طبیعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تاریک خیالی کہنا اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنی سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ فلسفہ و سائنس میں کچھ بھی دست گاہ نہ رکھتا ہو اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرہ برابر بھی کوشش نہ کی ہو، صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جا سکے۔ روحانیت (Spiritualism) یا فوق الطبیعت (Super Naturalism) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا سائنٹیفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے

دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریۂ ارتقاء کی تائید میں پیش کئے تھے، کمزور اور محتاج ثبوت تھے۔ اس سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں۔ اہل حکمت اس وقت بھی اس نظریئے سے مطمئن نہ تھے حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (Huxley) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر لیا گیا۔ اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلہ کے طور پر اسے استعمال کیا گیا کیونکہ اس نظریہ نے اہل حکمت کے زعم باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کر دیا تھا (حالانکہ دراصل اس نے ایک دعویٰ کیا تھا جو خود محتاج ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر آپ سے آپ طبیعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہل مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ آف اکسفورڈ اور گلیڈاسٹن نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی اور آخرکار اہل مذہب سائنٹیفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوتے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے افکار کو الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس سے آخرکار بالشوزم اور فاشزم کو پھلنے پھولنے اور بارآور ہونے کا موقع ملا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے

استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں تمام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان وشوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رُخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب وہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جاتے اس پر وہ بے تامل اٰمنّا وصدّقنا کہیں اور قرآن وحدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول وفروع اکثر وبیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلّم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی ورسالت کے اعتقاد پر قائم ہے۔ اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب وتمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضع قانون ہے۔ رسول خدا شارحِ قانون

اور انسان صرف متبعِ قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضعِ قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضعِ قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمحِ نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمحِ نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رُخ بین الاقوامیت (Internationalis m) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (Nationalism) معاشیات میں اسلام اکلِ حلال اور زکوٰۃ وصدقہ اور تحریمِ سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدودِ زن و مرد، تعددِ ازدواج، قوانینِ نکاح و طلاق، ضبطِ ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوقِ زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیرِ اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انہوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو بر سرِ غلط سمجھا اور اس کے

اصول وقوانین میں ترمیم وتنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن رجب ۱۳۵۳ھ ۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء)

دَورِ جدید کی بیمار قومیں

مشرق ہو یا مغرب، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہو گئی ہے جس نے سراسر مادیت کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اس کی حکمتِ نظری و حکمتِ عملی، دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سائنس، اس کا اخلاق، اس کی معاشرت، اس کی سیاست، اس کا قانون، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رُخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آ رہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایسے لوگوں میں ہوا جن کے پاس درحقیقت حکمتِ الٰہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا وہاں ضرور موجود تھے، مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی، ان کے پاس علم نہ تھا، ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا۔ محض ایک غلط مذہبی تخیل تھا جو فکر و عمل کی راہوں میں نوعِ انسانی کو سیدھے راستے پر اگر چلانا چاہتا بھی تو نہ چلا سکتا تھا۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ علم و حکمت کی ترقی میں سدِ راہ بن جاتا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیت کو ٹھوکر مار کر ایک دوسرے راستے پر چل پڑے جس میں مشاہدہ، تجربہ اور قیاس و استقراء کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما

نہ تھی۔ یہی ناقابلِ اعتماد رہنما، جو خود ہدایت اور نور کے محتاج ہیں، ان کے معتمد علیہ بن گئے۔ ان کی مدد سے انہوں نے فکر و نظر، تحقیق و اکتشاف، اور تعمیر و تنظیم کی راہ میں بہت کچھ جدوجہد کی مگر ان کو ہر میدان میں ایک غلط نقطۂ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رُخ ایک غلط منزلِ مقصود کی طرف پھر گیا۔ وہ الحاد اور مادیت کے نقطہ سے چلے۔ انہوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ آفاق اور انفس میں یہ سمجھ کر نظر کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس سے انہوں نے قانونِ فطرت کو جانا اور سمجھا، مگر اس کے فاطر تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے موجودات کو مسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا مگر اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیاء کے مالک اور حاکم نہیں ہیں بلکہ اصلی مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت و غفلت نے انہیں ذمہ داری اور جوابدہی کے بنیادی تصور سے بیگانہ کر دیا۔ اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہو گئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے، اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے جو فکر و عمل کے ہر میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لیے جا رہی ہے جن کی درمیانی منزلیں تو نہایت خوش آیند اور نظر فریب ہیں مگر آخری منزل بجز ہلاکت کے اور کوئی نہیں۔ وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنایا۔ اخلاق کو نفسانیت نہ دیا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ معیشت پر خود غرضی اور برادر کشی کا شیطان مسلط کر دیا۔ معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی اور خودکامی کا زہر اتار دیا۔ سیاست

کو قوم پرستی و وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات، اور خداوند طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا۔ غرض یہ کردہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں، جس کے پھول خوشنما مگر خاردار ہیں، جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہے۔

اہل مغرب جنہوں نے اس شجر خبیث کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، اب خود اس سے بیزار ہیں۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ جس شاخ کو کاٹتے ہیں اس کی جگہ بہت سی خاردار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پر تیشہ چلایا تو اشتراکیت نمودار ہو گئی۔ جمہوریت پر ضرب لگائی تو ڈکٹیٹرشپ پھوٹ نکلی۔ اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے قوانین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سر اٹھایا۔ غرض فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تہذیب و تمدن کے بداصل درخت سے نکل رہا ہے اور اس نے مغربی زندگی کو از سرتاپا مصائب و آلام کا ایک پھوڑا بنا دیا ہے جس کی ہر رگ میں ٹیس اور ہر ریشے میں دکھن ہے۔ مغربی قومیں درد سے بے تاب ہو رہی ہیں۔ ان کے دل بے قرار ہیں۔ ان کی روحیں کسی امرت رس کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ مگر انہیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجر خبیث کی محض شاخوں

میں ہے اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہے مگر نہیں سمجھتی کہ خرابی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصل فاسد سے فرع صالح نکلنے کی اُمید رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے صحیح العقل لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ ان کے شجر تہذیب کی جڑ خراب ہے مگر چونکہ وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی ہڈی بوٹی بنی ہے، اس لیے ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس اصل کے بجائے کونسی دوسری اصل ایسی ہو سکتی ہے جو صالح برگ و بار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ میں دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے۔ وہ سب کے سب بے تابی کے ساتھ کسی چیز کے طالب ہیں جو ان کے درد کا درماں کرے، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ ان کا مطلوب کیا ہے اور کہاں ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری روحیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو، یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح، جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی، جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جاں بخش بھی، جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی۔ یہاں تم کو خالص حکمت عملی ملے گی، یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ملے گا، یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے، یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزار دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے سکونِ قلب اور جمعیت خاطر

کا سرچشمہ ہے، یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور پائدار قواعد ملیں گے جو انسانی فطرت کے علم جامع پر مبنی ہیں اور خواہشات نفس کے اتباع میں بدل نہیں سکتے، یہاں تم کو تہذیب و تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی مصنوعی تفریقوں کو مٹا کر خالص عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں اور عدل، مساوات، فیاضی اور حسن معاملت کی ایسی پر امن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں افراد اور طبقات اور فرقوں کے درمیان حقوق کی کش مکش اور مفاد و مصالح کے تصادم اور اغراض و مقاصد کی جنگ کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہتا بلکہ سب کے سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہو تو قبل اس کے کہ تمہاری تہذیب ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک اور مٹی ہوئی تہذیب کا اضافہ کرے تم کو چاہیئے کہ اسلام کے خلاف ان تمام تعصبات کو، جو تمہیں قرون وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثت میں ملے ہیں اور جن کو تم نے اس تاریک دور کی تمام دوسری چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا ہے، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔

مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے، اسباب مرض بھی دوسرے ہیں، مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہل مغرب کا ہے۔ یعنی اس علم و ہدایت کی طرف رجوع جس کو اللہ نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوتے ہیں۔ رومی، فارسی، ہندی اور چینی تہذیبیں اُس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب اسلام اپنے متبعین کی فکری وعملی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ حکمران تھا۔ جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کار فرما تھی، روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے اور تمام اقوام عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ اس وقت کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔ انہوں نے جس طرف رُخ کیا، قوموں کے خیالات، نظریات، علوم، اخلاق وعادات اور طرزِ تمدن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں تاثر کی قابلیت کم اور تاثیر کی قوت بہت زیادہ تھی۔ بلاشبہ انہوں نے دوسروں سے بہت کچھ لیا، مگر ان کی تہذیب کا مزاج اس قدر طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی اور کسی بیرونی اثر سے اس میں سوءِ مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انہوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوتے۔ بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں، اور بعض جن میں زندگی کی طاقت زیادہ تھی وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے اصول میں بہت کچھ تغیر واقع ہو گیا۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

مسلمان صدیوں تک قلم اور تلوار کے ساتھ فرماں روائی کرتے کرتے آخرکار تھک گئے۔ ان کی روحِ جہاد سرد پڑ گئی۔ قوتِ اجتہاد شل ہو گئی جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی اس کو انہوں نے محض ایک متبرک یادگار بنا

کر غلافوں میں لپیٹ دیا۔ جس ہادی اعظم ؐ کی سنت نے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام کی صورت بخشی تھی اس کی پیروی کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ بہتا ہوا دریا یکایک جمود کی وادی میں ٹھہر کر تالاب بن گیا۔ امامت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے۔ دنیا کی قوموں پر ان کے افکار، ان کے علوم، ان کے تمدن اور ان کے سیاسی اقتدار نے جو قابو پا لیا تھا، ان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پھر اسلام کے بالمقابل ایک دوسری تہذیب نے جنم لیا۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھا لیا۔ مسلمان سوتے رہے اور اہلِ مغرب اس جھنڈے کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے، یہاں تک کہ امامت کا منصب جس سے یہ معزول ہو چکے تھے ان کو مل گیا۔ ان کی تلوار نے دنیا کے سوادِ اعظم کو فتح کیا۔ ان کے افکار و نظریات، علوم و فنون اور اصولِ تہذیب و تمدن دنیا پر چھا گئے، ان کی فرمانروائی نے صرف اجسام ہی کا نہیں، دلوں اور دماغوں کا بھی احاطہ کر لیا۔ آخر صدیوں کی نیند سے جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دوسرے اس پر قابض ہو چکے ہیں۔ اب علم ہے تو ان کا ہے، تہذیب ہے تو ان کی ہے، قانون ہے تو ان کا ہے، حکومت ہے تو ان کی ہے، مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ بلکہ

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔ یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلہ کی تہذیب نہیں۔ اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر

اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے، نہ اسلامی اخلاق، نہ اسلامی افکار ہیں نہ اسلامی جذبہ۔ حقیقی اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے نہ مدرسوں میں نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ ان کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں۔ تمدن و تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ، جامد اور پس ماندہ تہذیب کا مقابلہ ایک ایسی تہذیب سے ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے، روشنیِ علم ہے، گرمیِ عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں۔ ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ڈھل رہے ہیں، ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصورات، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست، ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔ ان کی نئی نسلیں اس تخیل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب سے ان کو مل رہا ہے۔ یہ شکست دراصل مسلمانوں کی شکست ہے مگر بدقسمتی سے اس کو اسلام کی شکست سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملک نہیں جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ ایک قوم نہیں جو اس خطرہ میں مبتلا ہو۔ آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے

درحقیقت یہ علما کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھتے، مغربی ممالک کا سفر کرکے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے اور ان نئے کل پرزوں کو اصول اسلام کے تحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علما۔ (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی، ان میں تفقہ نہ تھا، ان میں حکمت نہ تھی، ان میں عمل کی طاقت نہ تھی، ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کر سکتے جب کہ زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم و عمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی، مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اٹھا کر ان

تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علما نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی، مگر مقابلہ کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جمود سے نہیں ہو سکتا۔ رفتارِ زمانہ کو منطق کے زور سے نہیں بدلا جا سکتا۔ نئے اسلحہ کے سامنے فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں دے سکتے۔

علما نے جن طریقوں سے امت کی رہنمائی کرنی چاہی ان کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں گھر چکی تھی وہ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اور حواس کو معطل کر کے کب تک طوفان کے وجود سے انکار کرتی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہتی؟ جس قوم پر تمدن و تہذیب کا جدید نظام سیاسی طاقت کے ساتھ محیط ہو چکا تھا وہ اپنی عملی زندگی کو مغلوبی و محکومی کی حالت میں اس کے نفوذ و اثر سے کس طرح بچا سکتی تھی؟ آخر کار وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ سیاست کے میدان میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں نے علم اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی شکست کھائی اور اب ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر خطہ میں مغربیت کا طوفان بلا کی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے جس کی رَو میں بہتے بہتے مسلمانوں کی نئی نسلیں اسلام کے مرکز سے دُور۔ کوسوں دُور نکل گئیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علما کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علما کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی

ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہیے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے ارد گرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ علوم اسلامی کے جواہر آج دنیا میں انہی بزرگوں کے دم سے قائم ہیں اور جو کچھ دینی تعلیم پھیل رہی ہے انہی کے ذریعہ سے پھیل رہی ہے۔ لیکن دو سو برس کی جو وسیع خلیج انہوں نے اپنے اور زمانۂ حال کے درمیان حائل کر رکھی ہے وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی۔ جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ

اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے مگر زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں۔ دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے، اسلامی تہذیب کی اسپرٹ سے بیگانہ ہے، اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے ناآشنا ہے۔ صرف دل کے ایک گوشہ میں ایمان کا تھوڑا بہت نور رکھتا ہے، باقی تمام حیثیتوں سے اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر چونکہ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے دست و بازو میں جو گاڑی چلانے کی طاقت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ملت کی گاڑی کو لے کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا راستہ بتائے۔

میں اس حالت کو دیکھ رہا ہوں اور اس کا خوفناک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکوں۔ لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نورِ بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے اس سے کام لے کر مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دوں اور کامیابی و ناکامی سے بے پروا ہو کر اپنی سی کوشش کر دیکھوں۔ کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوششیں خود مجھ کو ہیچ میرز معلوم ہوتی ہیں مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ

بھی ہے اس قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ میرا کام کوشش ہے اور اپنی حدِ وسع تک میں اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتا ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۴ھ۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

انسانی قانون اور الٰہی قانون

گذشتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء کی ابتدا میں امریکہ کے قانون تحریم خمر (Prohibition Law) کی تنسیخ کا باقاعدہ اعلان ہوگیا اور تقریباً چودہ برس کے بعد نئی دنیا کے باشندوں نے پھر "خشکی" سے "تری" کے حدود میں قدم رکھا۔ جمہوریہ امریکہ کی صدارت پر مسٹر روزولیٹ کا فائز ہونا خشکی پر تری کی فتح کا اعلان تھا۔ اس کے بعد پہلے تو اپریل ۱۹۳۳ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے ۳.۲ فی صدی الکحل کی شراب کو جائز کیا گیا، پھر چند مہینے نہ گزرے تھے کہ دستور جمہوریہ امریکہ کی اٹھارہویں ترمیم ہی منسوخ کر دی گئی جس کی رو سے ریاست ہائے متحدہ کے حدود میں شراب کی خرید و فروخت، درآمد و برآمد اور ساخت و پرداخت حرام قرار دی گئی تھی۔

قانون کے ذریعہ سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اٹھارہویں ترمیم سے پہلے کئی سال تک اینٹی سیلون لیگ (Anti Saloon league) رسائل و جرائد، خطبات، تصاویر، میجک لنیٹرن، سینما اور بہت سے دوسرے طریقوں سے شراب کی مضرتیں اہل امریکہ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی رہی اور اس تبلیغ میں اس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تحریک کی ابتدا سے لے کر ۱۹۲۵ء تک نشر و اشاعت پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوتے اور شراب کے خلاف

جس قدر لٹریچر شائع کیا گیا وہ تقریباً ۹ ارب صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کے علاوہ قانون تحریم کی تنفیذ کے مصارف کا جس قدر بار گزشتہ چودہ سال
میں امریکی قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کی مجموعی مقدار ۶۵ کروڑ پونڈ بتائی جاتی
ہے۔ اور حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے محکمۂ عدل نے جنوری ۱۹۲۰ء سے اکتوبر
۱۹۳۳ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون
کی تنفیذ کے سلسلے میں دو سو آدمی مارے گئے۔ ۵۳۴۳۳۵ قید کیے گئے۔ ایک کروڑ
ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرمانے عائد کیے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کی مالیت کی
املاک ضبط کی گئیں۔

جان و مال کے یہ ہولناک نقصانات صرف اس لیے برداشت کیے گئے کہ
بیسویں صدی کی اس "مہذب ترین" قوم کو جس کا آفتاب علم نصف النہار پر پہنچا
ہوا ہے، ام الخبائث کی بے شمار روحانی، اخلاقی، جسمانی اور مالی مضرتوں سے
آگاہ کیا جائے۔ لیکن تحریم سے پہلے کئی سال کی مسلسل کوششیں، جن میں حکومت کی
طاقت بھی شریک تھی، امریکی قوم کے عزم مے خواری کے آگے ناکام ہو گئیں اور
تاریخ عالم کا بڑا اصلاحی جہاد آخر کار بے سود ثابت ہوا۔

تحریم خمر کی یہ ناکامی اور قانون تحریم کی یہ تنسیخ کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ
شراب کی وہ مضرتیں جن کو دور کرنے کے لیے پروپیگنڈا اور قانون کی طاقت استعمال
کی گئی تھی، اب منفعتوں سے بدل گئی ہیں، یا کسی نئے علمی اکتشاف نے ان خیالات
کو غلط ثابت کر دیا ہے جو پہلے قائم کیے گئے تھے۔ برعکس اس کے آج پہلے سے
بھی زیادہ وسیع و کثیر تجربات کی بنا پر یہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ قحبہ گری، زنا

عمل قوم لوط، چوری، قماربازی، قتل وخون اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی مفاسد اس ام الخبائث کے قریب ترین رشتہ دار ہیں۔ اور مغربی اقوام کے اخلاق، صحت معیشت اور معاشرت کی تباہی میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس چیز نے آج حکومت امریکہ کو اپنا قانون واپس لینے اور حرام کو حلال کر دینے پر مجبور کر دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ امت امریکیہ کی عظیم اکثریت کسی طرح شراب چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی اور وہی پبلک جس کے ووٹ نے اب سے چودہ برس پہلے یہ چیز حرام کی تھی اب اس کو حلال کرنے پر اصرار کرنے لگی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے مے خواری کے نقصانات سے کسی بڑے سے بڑے حامی شراب نے بھی کبھی انکار نہیں کیا اور نہ کبھی مخالفین تحریم نے شراب کے محاسن کی کوئی ایسی فہرست پیش کی جو ان قبائح کے مقابلہ میں کچھ بھی وزن رکھتی ہو۔ جس وقت امریکن کانگریس میں رائے عام کی تائید سے دستور کی اٹھارہویں ترمیم پیش ہوئی تھی اس وقت "خشکی" اور "تری" کے درمیان ہر طرح موازنہ کر لیا گیا تھا اور انہی تمام مضرتوں اور خرابیوں کا لحاظ کرتے ہوئے کانگریس نے وہ ترمیم منظور کی تھی، ۴۶ ریاستوں نے اس ترمیم کی توثیق کی تھی، دارالمبعوثین (House of Representatives) اور مجلس شیوخ (Senate) نے اس ترمیم کے مطابق قانون تحریم (Volstead Act) پاس کیا تھا۔ یہ سب کچھ امریکی قوم کی مرضی سے ہوا اور جب تک تحریم کا معاملہ کاغذ اور زبان تک رہا قوم خوشی خوشی اس کی تائید کرتی رہی مگر جونہی کہ یہ تحریم عالم معاملہ میں آئی، تمام امت امریکیہ کا رنگ بدل گیا۔ ام الخبائث کے ہجر میں پہلی رات بسر کرتے ہی دنیا کی سب سے زیادہ متمدن، ذی علم، ذی ہوش

حقائق پسند اور ترقی یافتہ قوم دیوانی ہوگئی، اور اس نے جوشِ جنون میں وہ ... یا
شروع کر دیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ قوم مشرقی شاعری کے خیالی عاشقوں کی طرح
فی الواقع اپنا سر پھوڑ ڈالے گی۔

اجازت یافتہ شراب خانوں کے بند ہوتے ہی تمام ملک میں لاکھوں خفیہ
شراب خانے (Speak easies and Blind pigs) قائم ہو گئے
جن میں قانون کی گرفت سے بچ کر شراب پینے پلانے بیچنے اور خریدنے کے عجیب
عجیب طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ کسی شخص کا اپنے کسی دوست یا عزیز کو کسی خفیہ
شراب خانے اور اس کے مقررہ اشارے (Pass Word) کا پتہ بتا دینا ایک
خاص مہربانی کا فعل سمجھا جاتا تھا۔ پہلے تو حکومت لائسنس یافتہ شراب خانوں کی
تعداد، ان کی شرابوں کی نوعیت اور ان میں آنے جانے والوں کے حالات کی نگرانی
کر سکتی تھی، مگر اب یہ بدکاری کے اڈے اس کی نگرانی کے حدود سے آزاد تھے۔ ان
کی تعداد قبل تحریم کے اجازت یافتہ شراب خانوں سے کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ ان میں ہر
قسم کی بدترین شرابیں فروخت ہونے لگیں جو صحت کے لیے غایت درجہ مضر تھیں۔
ان میں کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی جس کے ہولناک نتائج
سے ریاست ہائے متحدہ کے اہلِ فکر میں عام اضطراب برپا ہو گیا۔ شراب کی قیمت
پہلے سے کئی گنی زیادہ ہو گئی۔ مے فروشی کا پیشہ ایک بڑا پُر منفعت پیشہ بن گیا اور
ہزاروں لاکھوں آدمی یہی کاروبار کرنے لگے۔ خفیہ مے خانوں کے علاوہ بکثرت پھیری
لگانے والے مے فروش (Boot Leggers) پیدا ہو گئے جو گویا چلتے پھرتے
مے خانے تھے۔ یہ لوگ مدرسوں، دفتروں، ہوٹلوں، تفریح گاہوں حتیٰ کہ لوگوں

کے گھروں تک پہنچ کر شراب بیچنے اور نئے نئے گاہک پیدا کرنے لگے کم سے کم اندازہ یہ ہے کہ زمانہ قبل تحریم کی بہ نسبت زمانہ بعد تحریم میں امریکہ کے مے فروشوں کی تعداد دس گنی زیادہ ہو گئی۔ شہروں سے گزر کر دیہات تک میں یہ کاروبار پھیل گیا۔ گاؤں گاؤں شراب کشید کرنے کے خفیہ کارخانے قائم ہو گئے۔ تحریم سے پہلے امریکہ میں عرق کشی کے اجازت یافتہ کارخانوں کی تعداد کل چار سو تھی۔ تحریم کے بعد سات سال کے اندر ۷۹۴۳ کارخانے دار پکڑے گئے، ۹۲۸۳۱ بھٹیاں ضبط کی گئیں اور پھر بھی شراب فروشی کے کاروبار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ محکمۂ تحریم کے ایک سابق کمشنر کا بیان ہے کہ "ہم کل کارخانوں اور بھٹیوں کا صرف دسواں حصہ پکڑ سکے" ہیں اسی طرح شراب کی مقدار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ تحریم کے زمانہ میں امریکہ کے باشندے ہر سال ۲۰ کروڑ گیلن شراب پینے لگے تھے۔ یہ مقدارِ استعمال، قبل تحریم کی مقدار سے بہت زیادہ تھی۔

جو شراب اس قدر کثیر مقدار میں استعمال کی جانے لگی تھی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی حد درجہ خراب اور مضرِ صحت تھی۔ اطبا کا بیان ہے کہ:۔

"اس چیز کو شراب کے بجائے زہر کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس کے حلق سے اترتے ہی معدے اور دماغ پر اس کے زہریلے اثرات مترتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور دو دن تک اعصاب اس سے متاثر رہتے ہیں۔ اس کے نشے میں انسان کسی خوش باشی اور خوش فعلی کے مطلب کا نہیں رہتا بلکہ اس کی طبیعت شورش اور ہنگامہ آرائی اور ارتکابِ جرم کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔"

اس قسم کی شرابوں کی کثرت استعمال نے اہل امریکہ کی جسمانی صحت کو تباہ کر ڈالا۔ مثال کے طور پر شہر نیویارک کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم سے پہلے ۱۹۱۸ء میں الکحل کے اثر سے بیمار ہونے والوں کی تعداد (۳،۴۱) اور مرنے والوں کی تعداد (۲۵۲) تھی۔ ۱۹۲۶ء میں بیمار ہونے والوں کی تعداد گیارہ ہزار اور مرنے والوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچ گئی۔ ان کے علاوہ جو لوگ بالواسطہ شراب کے اثرات سے متاثر ہو کر ہلاک یا زندہ درگور ہو گئے ان کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح جرائم، خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے جرائم میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ امریکہ کے ججوں کا بیان ہے کہ "ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کبھی اتنی کثیر تعداد میں بچے بحالت نشہ گرفتار ہوئے ہوں"۔ جب کمسنی کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو اس کی تحقیقات کی گئی اور ثابت ہوا کہ ۱۹۲۰ء سے نوجوانوں کی مے خواری اور عربدہ جوئی میں سال بسال زیادتی ہوتی جا رہی ہے، حتیٰ کہ بعض شہروں میں ۸ سال کے اندر دو سو فیصدی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں امریکہ کی نیشنل کرائم کونسل (National Crime Council) کے ڈائرکٹر کرنل موس (Col Moss) نے بیان کیا کہ اس وقت امریکہ کے تین آدمیوں میں سے ایک آدمی جرائم پیشہ ہے اور ہمارے ہاں قتل کے جرائم میں ساڑھے تین سو فیصدی اضافہ ہوا ہے۔

غرض چودہ سال کے اندر اندر امریکہ میں تحریم خمر کے جو نتائج ظاہر ہوتے ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

قانون کا احترام دلوں سے اٹھ گیا اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں خلاف ورزی

قانون کی بیماری پھیل گئی۔

تحریم خمر کا اصل مقصد بھی حاصل نہ ہوا، بلکہ اس کے برعکس یہ چیز حرام ہونے کے بعد اس سے بھی زیادہ استعمال ہونے لگی جتنی حلال ہونے کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھی۔

قانونِ تحریم کی تنفیذ میں حکومت کا اور خفیہ طریقہ سے شراب خریدنے میں رعایا کا بے حساب مالی نقصان ہوا اور ایک ملک کے معاشی حالات تباہ ہونے لگے۔

امراض کی کثرت، صحت کی بربادی، شرحِ اموات میں اضافہ، اخلاق عامہ کا فساد، سوسائٹی کے تمام طبقات اور خصوصاً نوخیز نسلوں میں ذمائم اور قبائح کا بکثرت شائع ہونا، اور جرائم میں غیر معمولی ترقی، یہ اس قانون کے تمدنی و اخلاقی ثمرات تھے۔

یہ نتائج اس ملک میں حاصل ہوتے جو بیسویں صدی کے روشن ترین زمانہ میں مہذب ترین ملک سمجھا جاتا ہے۔ جس کے باشندے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ جن کے دماغ علم وحکمت کی روشنی سے منور ہیں۔ جو اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ نتائج اس حالت میں ظاہر ہوتے جبکہ کروڑہا روپیہ صرف کرکے اور کئی ارب رسالے اور کتابیں شائع کرکے تمام قوم کو شراب کے نقصانات سے آگاہ کردیا گیا تھا۔

یہ نتائج اس کے باوجود ظاہر ہوتے کہ امریکی قوم کی ایک بڑی اکثریت تحریم کی ضرورت کو تسلیم کرچکی تھی اور تحریم کا قانون اس کی مرضی سے بننا اور پاس

ہوا تھا۔

پھر اس نتائج کا ظہور ایسی حالت میں ہوا جب کہ امریکہ کی عظیم الشان سلطنت بیسویں صدی کی بہترین تنظیم کے ساتھ کامل چودہ سال تک شراب نوشی اور شراب فروشی کا قلع قمع کرنے پر تلی رہی۔

جب تک یہ نتائج ظاہر نہ ہوتے تھے حکومت اور رعیت دونوں کی اکثریت شراب کو حرام قرار دینے پر متفق تھی اس لیے شراب حرام ہو گئی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ قوم کسی طرح شراب چھوڑنے پر راضی نہیں ہے اور زبردستی شراب چھڑانے کا نتیجہ پہلے سے بھی خراب نکلا ہے، تو اسی حکومت اور رعیت کی اکثریت نے شراب کو حلال کرنے پر اتفاق کر لیا۔

اب ذرا ایک نظر اس ملک کی حالت پر ڈالیے جو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے تاریک ترین زمانے میں سب سے زیادہ تاریک ملک شمار ہوتا تھا۔ باشندے ان پڑھ۔ علوم و فنون کا نام و نشان نہیں۔ تمدن و تہذیب کا پتہ نہیں، پڑھے لکھوں کی تعداد شاید دس ہزار میں ایک اور وہ بھی ایسے کہ آجکل کے کم سواد بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہوں گے۔ موجودہ زمانے کے تنظیمی ادارات اور وسائل یکسر مفقود، حکومت کا نظام بالکل ابتدائی حالت میں اور اس کو قائم ہوتے چند سال سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ باشندوں کا حال یہ کہ شراب کے عاشق۔ ان کی زبان میں شراب کے تقریباً ڈھائی سو نام پائے جاتے ہیں جن کی مثال شاید دنیا کی کسی زبان میں نہ ملے گی۔ یہ شراب کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف کا ثبوت ہے۔ اور اس کا مزید ثبوت ان کی شاعری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی

اور لازمۂ حیات سمجھی جاتی تھی۔

اس حالت میں وہاں شراب کا مسئلہ پیش ہوتا ہے اور رسولِ خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خدا کا ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ۔ رکوع ۲۷)

یہ تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑی خرابی ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے

یہ کوئی حکم نہ تھا بلکہ محض شراب کی حقیقت بتائی گئی تھی کہ اس میں اچھائی اور برائی دونوں موجود ہیں، مگر برائی کا پہلو غالب ہے۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ قوم کے ایک گروہ نے اسی وقت سے مے خواری چھوڑ دی۔ تاہم اکثریت بدستور شراب کی خوگر رہی۔

پھر دوبارہ شراب کے بارے میں حکم پوچھا گیا۔ کیونکہ بعض لوگ نشے کی حالت میں نماز پڑھتے اور غلطیاں کر جاتے تھے۔ اس پر رسولِ خدا نے اپنے خدا کی طرف سے یہ حکم سنایا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (النساء۔ رکوع ۷)

اے ایمان والے والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ (نماز تم کو اس حالت میں پڑھنی چاہیے جبکہ) تم جان سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

یہ حکم سنتے ہی لوگوں نے مے خواری کے لیے اوقات مقرر کرلیے اور عموماً فجر اور ظہر کے درمیان یا عشاء کے بعد شراب پی جانے لگی تاکہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کی نوبت نہ آئے یا نشے کی وجہ سے نماز نہ ترک کرنی پڑے۔

مگر شراب کی اصلی مضرت ابھی باقی تھی۔ نشے کی حالت میں لوگ فساد برپا کرتے تھے اور خون خرابے تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے پھر خواہش کی گئی کہ شراب کے بارے میں صاف اور قطعی حکم دیا جائے۔ اس پر ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ۔ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔ (المائدہ رکوع ۱۲)

اے ایمان لانے والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب شیطان کی ساختہ پرداختہ گندگیاں ہیں۔ لہٰذا تم ان سے پرہیز کرو۔ اُمید ہے کہ اس پرہیز سے تم کو فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ کیا یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب تم ان سے باز آؤ گے؟ اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ۔ لیکن اگر تم نے سرتابی کی تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ صاف صاف حکم پہنچادے

یہ حکم آنا تھا کہ وہی شراب کے رسیا اور دختِ رز کے عاشق جو اس چیز کے نام پر

جان دیتے تھے، یکایک اس سے نفور ہو گئے۔ تحریم شراب کی منادی سنتے ہی شراب کے مٹکے توڑ دیتے گئے۔ مدینے کی گلیوں میں شراب کے نالے بہہ گئے۔ ایک محفل میں مے نوشی ہو رہی تھی اور دس گیارہ اصحاب شراب کے نشے میں چور تھے۔ اتنے میں رسول اللہ کے منادی کی آواز کانوں میں پہنچی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ اسی نشے کی حالت میں حکم خدا کا یہ احترام کیا گیا کہ فوراً شراب کا دور روک دیا گیا اور مٹکے توڑ ڈالے گئے۔ ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ شراب پی رہا تھا۔ منہ سے پیالا لگا ہوا تھا۔ کسی نے آکر تحریم خمر کی آیت پڑھی۔ فوراً پیالا اس کے لبوں سے الگ ہو گیا۔ اور پھر ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہ اُترا۔ اس کے بعد جس کسی نے شراب پی اس کو جوتوں، لکڑیوں، لات مکوں سے پیٹا گیا، پھر چالیس کوڑوں کی سزا دی جانے لگی۔ پھر اس جرم کے لیے اسی کوڑوں کی سزا مقرر کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب سے میخواری کا نام و نشان مٹ گیا۔ پھر اسلام جہاں پہنچا، اس نے قوموں کو آپ سے آپ "خشک" (پرہیزگار) بنا دیا تھا کہ آج بھی جب کہ اسلام کا اثر بہت ضعیف ہو چکا ہے، دنیا میں کروڑوں انسان ایسے بستے ہیں جو کسی "قانون تحریم" اور کسی نظام تعزیری کے بغیر شراب سے بالکل مجتنب ہیں۔ مسلمان قوم میں اگر مردم شماری کر کے دیکھا جائے کہ میخواروں کی تعداد کا فی صدی اوسط کیا ہے تو شاید یہ قوم اب بھی دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پرہیزگار پائی جائے گی۔ پھر اس قوم میں جو لوگ شراب پیتے بھی ہیں وہ بھی اس کو گناہ سمجھتے ہیں، دل میں اپنے فعل پر نادم ہوتے ہیں، اور بسا اوقات خود بخود تائب ہو جاتے ہیں۔

عقل و حکمت کی مملکت میں آخری فیصلہ تجربہ و مشاہدہ پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ

شہادت کبھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ اب آپ کے سامنے ایک تجربہ امریکہ کا ہے اور دوسرا تجربہ اسلام کا۔ دونوں کا فرق بالکل ظاہر ہے، اب یہ آپکا کام ہے کہ ان کا تقابل کرکے اس سے سبق حاصل کریں۔

امریکہ میں برسوں تک شراب کے خلاف تبلیغ کی گئی۔ کروڑوں روپیہ اس کی مضرتوں کے اعلان و اشتہار پر صرف کیا گیا۔ فن طب سے، اعداد و شمار کی شہادتوں سے، عقلی استدلالات سے، اس کے جسمانی، اخلاقی، معاشی نقصانات اس طرح ثابت کیے گئے کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تصویروں کے ذریعہ سے شراب کی مضرتیں برأی العین مشاہدہ کرادی گئیں اور پوری کوشش کی گئی کہ لوگ خود اس کی خرابیوں کے قائل ہو کر اس کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر قوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت (کانگریس) نے اکثریت کے ساتھ اس کی تحریم کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے قانون پاس کر دیا۔ پھر حکومت نے (اور اس حکومت نے جو اس وقت دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں سے ہے) اس کی خرید و فروخت، ساخت و پرداخت، درآمد و برآمد کو روکنے کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر ڈالیں۔ مگر قوم (اور وہ قوم جو اس وقت تعلیم یافتہ اور روشن خیال قوموں کی صف اوّل میں ہے) اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی آخرکار چودہ پندرہ برس کی قلیل مدت ہی میں قانون مجبور ہو گیا کہ حرام کو پھر حلال کر دے۔

دوسری طرف اسلام میں شراب کے خلاف کوئی پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ نشر و اشاعت پر ایک پیسہ بھی صرف نہ ہوا۔ کوئی اینٹی سیلون لیگ قائم نہیں کی گئی۔ اللہ کے رسولؐ نے بس اتنا کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے شراب حرام کر دی ہے، اور جونہی کہ یہ حکم اس زبان سے نکلا تمام قوم اور وہ قوم جو شراب کے عشق میں امریکہ

سے بڑھ کر تھی مگر اصطلاحی علم و دانش میں ان سے کوئی نسبت نہ رکھتی تھی) شراب سے باز آگئی اور ایسی باز آئی کہ جب تک وہ اسلام کے دائرے میں ہے اس کی "خشکی" "تری" کی جانب تجاوز کرنا ممکن نہیں ہے۔ "خشکی" کے حصار میں بند رہنے کے لیے وہ کسی حاکمانہ قوت، کسی احتساب اور کسی نظام تعزیری کی محتاج نہیں ہے۔ اگر کوئی قوت جابرہ موجود نہ ہو تب بھی اس سے باز رہے گی۔ پھر یہ تحریم ایسی تحریم نہیں ہے جس کو کسی طرح تحلیل سے بدلا جا سکتا ہو۔ اگر تمام عالم کے مسلمان بالاتفاق شراب کی تائید میں ووٹ دے دیں تب بھی یہ حرام کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔

آپ اس عظیم الشان تفاوت کے اسباب پر غور کریں گے تو اس سے چند ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو نہ صرف شراب کے معاملہ میں، بلکہ قانون و اخلاق کے تمام مسائل میں اصولِ کلیہ کا حکم رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسانی معاملات کی تنظیم میں اسلام اور دنیوی قوانین کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ دنیوی قوانین کا انحصار سراسر انسانی رائے پر ہے اس لیے وہ نہ صرف اپنے کلیات بلکہ ہر ہر جزئیہ میں عوام یا خواص کی رائے کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں، اور انسانی رائے کا (خواہ وہ عوام کی ہو یا خواص کی) حال یہ ہے کہ وہ ہر آن داخلی میلانات و رجحانات، خارجی اسباب و عوامل، اور علم و عقل کے تغیر پذیر احکام سے (جو ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ صحیح ہوں) متاثر ہوتی رہتی ہے۔ ان تاثرات سے آرا و افکار میں تغیر ہوتا ہے۔ اس تغیر سے لازمی طور پر اچھے اور برے، صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، حرام اور حلال کے معیارات بدلتے رہتے ہیں، اور ان کے بدلنے کے ساتھ ہی قانون کو بھی بدل جانا پڑتا ہے

اس طرح اخلاق اور تہذیب کا کوئی پائیدار، مستقل، ناقابلِ تغیر معیار قائم ہی نہیں ہونے پاتا۔ انسان کا تلون قانون پر حکمرانی کرتا ہے، اور قانون کا تلون انسانی زندگی پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نوشق موٹر چلا رہا ہو اور اس کے ناآزمودہ ہاتھ بے قاعدگی کے ساتھ اسٹیرنگ کو کبھی ادھر اور کبھی ادھر گھما رہے ہوں۔ اس کی ان بے قاعدہ گردشوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موٹر کی حرکت بھی بے قاعدہ اور غیر مستقیم ہوگی، وہ استقلال کے ساتھ کسی ایک معین راستہ پر نہ چل سکے گی، اور جب وہ آڑی ترچھی رفتار سے چلے گی تو خود چلانے والے حضرت ہی پر اس کا اثر پڑے گا۔ کبھی وہ سیدھے راستہ پر ہوں گے اور کبھی ٹیڑھے راستہ پر۔ کہیں کسی گڑھے میں جا گریں گے، کہیں کسی دیوار سے ٹکرائیں گے، اور کہیں نشیب و فراز کے دھچکے کھائیں گے۔

بخلاف اس کے اسلام میں قانون و اخلاق کے کلیات تمام تر اور جزئیات بیشتر خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوتے ہیں، انسانی رائے کو ان میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے اور جزئیات میں کسی حد تک دخل ہے بھی تو وہ صرف اس قدر ہے کہ زندگی کے تغیر پذیر حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کلی احکام اور جزئی نظائر سے حسبِ موقع نئے جزئیات مستنبط کرتے رہیں، جن کو لازماً اصولِ شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس الٰہی قانون سازی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اخلاق اور تہذیب کا ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر معیار موجود ہے۔ ہمارے اخلاقی و مدنی قوانین میں تلون کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کل کا حرام آج حلال اور کل پھر حرام نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو جو حرام کر دیا گیا وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے، اور جو حلال کر دیا گیا وہ قیامت تک حلال ہے۔ ہم نے اپنی موٹر کار کا اسٹیرنگ ایک ماہر کامل کے ہاتھ میں دے دیا ہے

اب ہم مطمئن ہیں کہ وہ موڑ کو سیدھے رستے پر چلا تے گا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (ابراہیم - ۲۷)

اللہ ایمان لانے والوں کو ایک پکی بات کے ذریعہ دنیا اور آخرت کی زندگی میں ثبات اور قرار بخشتا ہے اور نافرمان ظالموں کو آوارہ کر دیتا ہے کہ کہیں جم نہیں سکتے۔

اس میں ایک دوسرا اہم نکتہ بھی ہے۔ دنیوی طاقتیں انسانی زندگی کے لیے ضوابط بنانے اور اخلاق، معاشرت اور تمدن کی اصلاح کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی محتاج رہتی ہیں کہ ہر جزئی معاملہ میں پہلے عوام کو اصلاح کے لیے راضی کریں پھر عمل کی جانب قدم بڑھائیں۔ ان کے قوانین کی ہر دفعہ اپنے نفاذ کے لیے عامۂ خلائق کی رضا پر منحصر ہوا کرتی ہے اور جس اصلاحی یا تنظیمی قانون کا نفاذ عوام کی رضا کے خلاف کر دیا گیا ہو اسے بعد از خرابیہائے بسیار منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہ صرف امریکہ کا تجربہ ہے بلکہ دنیا کے تمام تجربات اس بات پر شہادت دے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی قوانین درحقیقت اصلاح اخلاق و معاشرت کے معاملہ میں قطعاً ناکارہ ہیں۔ وہ جن بگڑے ہوتے لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں انہی کی رضا پر ان قوانین کا منظور یا نامنظور ہونا اور نافذ یا منسوخ ہو جانا منحصر ہے۔

اسلام نے اس اشکال کو ایک دوسرے طریقہ سے حل کیا ہے، آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس مشکل کا کوئی حل بجز اس کے نہیں ہے۔ وہ تمدن، معاشرت اور اخلاق کے مسائل کو چھیڑنے اور قوانین شریعت کی اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لے آئے۔

یہ بات یقیناً انسان کی رضا پر منحصر ہے کہ وہ ایمان لاتے یا نہ لاتے۔ مگر جب وہ ایمان
لے آیا تو اس کی رضا و عدم رضا کا کوئی سوال باقی نہ رہا۔ اب خدا کی طرف سے اس کا رسول
جو حکم بھی دے اور خدا کی کتاب جو قانون بھی مقرر کرے وہ اس کے لیے واجب الاطاعت
ہے۔ اس ایک اصل کے قائم ہو جانے کے بعد شریعت اسلامی کے تمام قوانین اس
پر نافذ ہو جائیں گے اور کسی جزئی یا کلی مسئلہ میں اس کی رضامندی یا نارضامندی کا دخل
نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جو کام کروڑوں بلکہ اربوں روپے کے صرف اور
بے نظیر تبلیغ و اشاعت اور حکومت کی زبردست کوششوں کے باوجود نہ ہو سکا وہ
عالم اسلامی میں خدا کی جانب سے رسول خدا کی صرف ایک منادی سے ہو گیا۔

تیسری سبق آموز بات یہ ہے کہ کوئی انسانی جماعت خواہ کتنی ہی علوم و فنون
کی روشنی سے بہرہ ور ہو، اور خواہ عقلی ترقیات کے آسمان ہی پر کیوں نہ پہنچ جائے،
اگر وہ الٰہی قوانین کی تابع فرمان نہ ہو اور ایمان کی قوت نہ رکھتی ہو تو کبھی ہوائے نفس
کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ اس پر خواہشات نفسانی کا غلبہ اتنا شدید رہے گا کہ
جس چیز پر اس کا نفس مائل ہوگا اس کی مضرتیں اگر آفتاب سے بھی زیادہ روشن کر کے
دکھا دی جائیں، اگر اس کے خلاف سائنس (یعنی پرستاران عقل کے معبود) کو بھی گواہ
بنا کر لا کھڑا کیا جائے، اگر اس کے مقابلہ میں اعداد و شمار کی بھی شہادت پیش کر دی
جائے (جو ارباب حکمت کی نگاہ میں ہرگز جھوٹی نہیں ہو سکتی)، اگر اس کی خرابیاں
تجربہ و مشاہدہ سے بھی ثابت کر دی جائیں، تب بھی وہ کبھی اپنے نفس کے معشوق
کو نہ چھوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں حاسۂ اخلاقی پیدا کرنا اور
اس کے ضمیر کی تشکیل کرنا اور اس میں اتنی طاقت بھر دینا کہ وہ نفس پر غالب آجائے،

فلسفہ و سائنس کے بس کی بات ہے اور نہ عقل و خرد کی۔ یہ کام بجز ایمان کے اور کسی چیز کے ذریعہ سے انجام نہیں پا سکتا۔

(ترجمان القرآن شوال ۱۳۵۱ھ۔ جنوری ۱۹۳۲ء)

مغربی تہذیب کی خودکشی

سیاست، تجارت، صنعت و حرفت اور علوم و فنون کے میدانوں میں مغربی قوموں کے حیرت انگیز اقدامات کو دیکھ کر دل اور دماغ سخت دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان قوموں کی ترقی لازوال ہے، دنیا پر ان کے غلبہ اور تسلط کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے، ربع مسکون کی حکومت اور عناصر کی فرماں روائی کا انہیں ٹھیکہ دے دیا گیا ہے۔ اور ان کی طاقت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے کہ کسی کے اکھاڑے نہیں اکھڑ سکتی۔

ایسا ہی گمان ہر زمانے میں ان سب قوموں کے متعلق کیا جا چکا ہے جو اپنے اپنے وقت کی غالب قومیں تھیں۔ مصر کے فراعنہ، عرب کے عاد و ثمود، عراق کے کلدانی، ایران کے اکاسرہ، یونان کے جہانگیر فاتح، روم کے عالمگیر فرمانروا، مسلمانوں کے جہاں کشا مجاہد، تاتار کے عالم سوز سپاہی، سب اس کرۂ خاکی کے اسٹیج پر اسی طرح غلبہ و قوت کے تماشے دکھا چکے ہیں۔ ان میں سے جس جس کے کھیل کی باری آئی، اس نے اپنی چلت پھرت کے کرتب دکھا کر اسی طرح دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہر قوم جب اٹھی ہے تو وہ اسی طرح دنیا پر چھا گئی ہے۔ اسی طرح اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شوکت و جبروت کے ڈنکے بجائے ہیں۔ اسی طرح دنیا نے مبہوت ہو کر گمان کیا ہے کہ ان کی طاقت لازوال ہے۔ مگر جب ان کی اجل پوری ہو گئی اور حقیقت

میں لازوال طاقت رکھنے والے فرمانروا نے ان کے زوال کا فیصلہ صادر کر دیا، تو وہ ایسے گرے کہ اکثر تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئے۔ اور بعض کا نام و نشان اگر دنیا میں باقی رہا بھی تو وہ اس طرح کہ وہ اپنے محکوموں کے محکوم ہوئے، اپنے غلاموں کے غلام بنے، اپنے مغلوبوں کے مغلوب ہو کر رہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (آل عمران - ۱۳۷)

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ ایک پیہم حرکت، تغیر اور گردش ہے جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی۔ ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہے، ہر بناؤ کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزاں ہے، ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک اتار ہے، اور اسی طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ آج ہوا میں اڑا اڑا پھرتا ہے، کل وہی زمین میں استحکام حاصل کر کے ایک تناور درخت بن جاتا ہے، پرسوں وہی سوکھ کر پیوند خاک ہو جاتا ہے اور فطرت کی نمو بخشنے والی قوتیں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ ہیں۔ انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے ہوئے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے کہ اتار ہی رہے گا۔ اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا۔ لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت کو بھی نہیں ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ (آل عمران - ۱۴۰)

دنیا کے حالات ایک طرح کی دوری حرکت میں گردش کر رہے ہیں۔ پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا، قوت اور ضعف، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی،

سب اسی گردش کے مختلف پہلو ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک
دورِ اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے، قوت اور زور دکھاتی ہے
حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے پھر ایک
دوسرا دور آتا ہے جس میں وہ گھٹتی ہے، مرجاتی ہے، ضعف اور ناتوانی میں
مبتلا ہوتی ہے، اور آخرکار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنھوں نے اس کی
ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اور دنیا کی سب چیزوں کے
مانند یہی سنت انسان پر بھی جاری ہے، خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے پایا جائے
یا قوم کی حیثیت سے، ذلت اور عزت، عسر اور یسر، تنزل اور ترقی، اور ایسی ہی
دوسری تمام کیفیات اسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں میں
تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گزرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی
ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کلیۃً محروم رکھا گیا ہو، یا جس پر کسی ایک کیفیت
کو دوام بخشا گیا ہو۔ عام اس سے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا ادبار کی۔ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (الاحزاب۔ ۶۲)

روئے زمین کے چپہ چپہ پر ہم کو ان قوموں کے آثار ملتے ہیں جو ہم سے پہلے
ہو گزری ہیں۔ وہ اپنے تمدن و تہذیب، اپنی صنعت و کاریگری، اپنی ہنرمندی
و چابک دستی کے ایسے نشانات دنیا میں چھوڑ گئی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ آجکل کی ترقی یافتہ اور غالب قوموں سے وہ کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے ہمعصروں
پر ان کا غلبہ کچھ ان سے زیادہ تھا۔ كَانُوٓا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّأَثَارُوا الْأَرْضَ

وَعَمَرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (الروم-۹) مگر پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ اقبال سامنے دیکھ کر وہ دھوکا کھا گئے۔ نعمتوں کی بارش نے ان کو غرہ میں ڈال دیا۔ خوشحالی ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ غلبہ اور حکومت سے مغرور ہو کر وہ جبار و قہار بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے نفس پر آپ ظلم کرنا شروع کر دیا۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (ہود-۱۴) خدا نے ان کی سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل دی۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ (الحج-۴۸) اور یہ ڈھیل بھی کچھ معمولی ڈھیل نہ تھی۔ بعض قوموں کو صدیوں تک یوں ہی ڈھیل دی جاتی رہی۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ مگر ہر مہلت ان کے لیے ایک نیا فتنہ بن گئی۔ وہ سمجھے کہ خدا ان کی تدبیروں کے مقابلہ میں عاجز آگیا ہے، اور اب دنیا پر خدا کی نہیں ان کی حکومت ہے۔ آخرکار قہر الٰہی بھڑک اٹھا۔ ان کی طرف سے نظر عنایت پھر گئی۔ اقبال کے بجائے ادبار کا دور آگیا۔ ان کی چالوں کے مقابلہ میں خدا بھی ایک چال چلا۔ مگر خدا کی چال ایسی تھی کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے پھر اس کا توڑ کہاں سے کرتے؟ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ خدا کی چال سامنے سے نہیں آتی، خود انسان کے اندر سے اس کے دماغ اور دل میں سرایت کر کے اپنا کام کرتی ہے، وہ انسان کی عقل، اس کے شعور، اس کی تمیز، اس کی فکر، اس کے حواس پر حملہ کرتی ہے، وہ اس کے سینے کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے۔ وہ اس کو آنکھوں کا اندھا نہیں بلکہ عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ اور جب اس کے دل کی آنکھیں پھوٹ جاتی

ہیں تو ہر تدبیر جو اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے، وہ الٹی اس کے خلاف پڑتی ہے۔ ہر قدم جو وہ کامیابی کے مقصود کی طرف بڑھاتا ہے، وہ اس کو ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے، اس کی ساری قوتیں خود اس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہیں، اور اس کے اپنے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (النمل ۵۱)

اس اقبال و ادبار کا ایک مکمل نقشہ ہم کو آل فرعون اور بنی اسرائیل کے قصے میں ملتا ہے۔ اہلِ مصر جب ترقی کے انتہائی مدارج کو پہنچ گئے تو انہوں نے ظلم و سرکشی پر کمر باندھی۔ ان کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، اور ایک کمزور قوم بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسفؑ کے زمانے میں وہاں جا کر آباد ہو گئی تھی حد سے زیادہ جور و ستم کا تختۂ مشق بنایا۔ آخر کار اس کی اور اہل مصر کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو خدا نے ارادہ کیا کہ ان کو نیچا دکھائے اور اسی ضعیف قوم کو سربلند کرے جس کو وہ ہیچ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اللہ کا ارادہ پورا ہوا۔ اس ضعیف قوم میں حضرت موسیٰؑ پیدا کئے گئے۔ ان کو خود فرعون کے گھر میں خود اس کے ہاتھوں سے پرورش کرایا گیا اور انہیں اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ انہوں نے فرعون کو نرمی کی راہ سے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو مسلسل تنبیہیں کی گئیں۔ قحط پر قحط پڑے۔ طوفان پر طوفان آئے، خون برسا، ٹڈی دل ان کے کھیتوں کو چاٹ گئے۔ جوؤں اور مینڈکوں نے ان کو خوب ستایا۔ مگر ان کے تکبر میں فرق نہ آیا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۔ جب تمام حجتیں ایک ایک کر کے ختم ہو چکیں تو عذاب الٰہی کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ خدا کے حکم سے

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے۔ فرعون اپنے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا اور مصر کی طاقت ایسی تباہ ہوئی کہ صدیوں تک نہ ابھر سکی فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ[1]۔ پھر بنی اسرائیل کی باری آئی۔ مصری قوم کو گرانے کے بعد کائنات کے حقیقی فرمانروا نے اس قوم کو زمین کی حکومت بخشی جو دنیا میں ذلیل و خوار تھی وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا[2] اور اس کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی۔ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ[3]۔ مگر یہ فضیلت اور وراثت ارضی حسن عمل کی شرط کے ساتھ مشروط تھی۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے پہلے ہی کہلوا دیا گیا تھا کہ تم کو زمین کی خلافت دی تو ضرور جائے گی، مگر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، (كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ)[4] اور یہ وہ شرط ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جس قوم کو بھی زمین کی حکومت دی جاتی ہے اس پر یہی شرط لگا دی جاتی ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ[5]

پس جب بنی اسرائیل نے اپنے رب سے سرکشی کی، اس کے کلام میں تحریف کی، حق کو باطل سے بدل دیا، حرام خوری، جھوٹ، بے ایمانی اور عہد شکنی کا شیوہ اختیار کیا، زر پرست، حریص، بزدل اور آرام طلب بن گئے، اپنے انبیاء کو قتل کیا، حق کی طرف بلانے والوں سے دشمنی کی، آئمہ خیر سے منہ موڑا، آئمہ شر کی اطاعت اختیار کی تو رب العالمین کی نظر ان کی طرف سے پھر گئی۔ ان سے زمین کی وراثت چھین لی گئی۔ ان کو عراق، یونان اور روم کے جابر سلاطین سے پامال کرایا گیا۔ ان کو گھر سے

۱؎ القصص۔۴۰ ۲؎ الاعراف۔۱۳۷ ۳؎ البقرہ۔۴۷ ۴؎ الاعراف۔۱۲۹ ۵؎ یونس۔۱۴

بے گھر کر دیا گیا۔ ان کو ذلت و خواری کے ساتھ ملک ملک کی خاک چھنوائی گئی۔ انتظام ان سے چھین لیا گیا۔ دو ہزار برس سے وہ خدا کی لعنت میں ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ دنیا میں ان کو عزت کا ٹھکانا نہیں ملتا۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآؤُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (البقرہ ۶۱)

آج یہی سنتِ الٰہی کا اعادہ پھر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ جس شامتِ اعمال میں پچھلی قومیں گرفتار ہوئی تھیں اسی شامت نے آج مغربی قوموں کو آن پکڑا ہے۔ جتنی تنبیہیں ممکن تھیں وہ سب ان کو دی جا چکی ہیں۔ جنگِ عظیم کے مصائب، معاشی مشکلات، بے کاری کی کثرت، امراضِ خبیثہ کی شدت، نظامِ عائلی کی برہمی، یہ سب کھلی ہوئی روشن آیات ہیں جن سے وہ اگر آنکھیں رکھتے تو معلوم کر سکتے تھے کہ ظلم، سرکشی، نفس پرستی، اور حق فراموشی کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان آیات سے سبق نہیں

لہ اس مضمون کی اشاعت کے چند سال بعد فلسطین میں اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی۔ اس پر لوگوں کے دل میں یہ شک گزرنے لگا کہ یہ بات قرآن کی پیش گوئی کے خلاف ہے۔ لیکن یہ ریاست اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ، انگلستان اور فرانس کے سہارے قائم ہوئی ہے۔ اور دنیا بھر سے یہودی اس چھوٹے سے خطے میں سمٹ سمٹ کر جمع ہو رہے ہیں۔ جس روز بھی یہ مغربی طاقتیں کسی بڑی جنگ میں الجھ کر اسرائیل کی حمایت کے قابل نہ رہیں گی، وہی دن ان کے لیے پیغام موت لیکر آئے گا اور گرد و پیش کی عرب آبادی اس گندگی کے پلندے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ بظاہر تو یہ یہودیوں کی کامیابی نظر آتی ہے کہ انہوں نے مغربی قوموں کی مدد سے عرب کی سرزمین میں زبردستی ایک قومی وطن حاصل کیا ہے۔ مگر دراصل یہ ان کے لیے ایک بہت بڑے عذاب کی تمہید ہے۔

لیتے۔ حق سے منہ موڑنے پر برابر اصرار کیے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر علتِ مرض تک نہیں پہنچتی۔ وہ صرف آثارِ مرض کو دیکھتے ہیں اور انہی کا علاج کرنے میں اپنی ساری تدابیر صرف کر رہے ہیں۔ اسی لیے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اب حالات کہہ رہے ہیں کہ تنبیہوں اور حجتوں کا دور ختم ہونے والا ہے اور آخری فیصلے کا وقت قریب ہے۔

قدرتِ الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلط کر دیتے ہیں جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ ایک قطعِ نسل کا شیطان ہے اور دوسرا قوم پرستی کا شیطان۔ پہلا شیطان ان کے افراد پر مسلط ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے وہ انہیں منعِ حمل کی تدبیریں سجھاتا ہے۔ اسقاطِ حمل پر آمادہ کرتا ہے۔ عملِ تعقیم (Sterilization) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی قوتِ تولید کا بیج ہی مار دیتے ہیں۔ انہیں اتنا شقی القلب بنا دیتا ہے کہ وہ بچوں کو آپ ہلاک کر دیتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو بتدریج ان سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبیر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خود غرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت، اور حرص و طمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو متخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھاتا ہے کہ یہ بھی عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ

بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ[1] وہ ان کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لیے تیار کر رہا ہے، جو تدریجی نہیں بلکہ اچانک ہوگی۔ اس نے تمام دنیا میں بارود کے خزانے جمع کر دیتے ہیں اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے۔ جونہی کہ اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانہ بارود کو شتابہ دکھا دے گا اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہوگی جس کے آگے تمام پچھلی قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی۔

یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے، بلکہ یورپ، امریکہ اور جاپان میں آئندہ جنگ کے لیے جس قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں ان کو دیکھ دیکھ کر خود ان کے اہل بصیرت لرز رہے ہیں، اور اس جنگ کے نتائج کا تصور کر کے ان کے حواس باختہ ہوتے جاتے ہیں۔ حال میں سرجل نیومان (Sergel Neuman) نے جو پہلے امریکہ کے ملٹری اسٹاف کا ایک رکن تھا، آئندہ جنگ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ آئندہ جنگ محض فوجوں کی لڑائی نہیں ہوگی بلکہ اسے ایک قتل عام کہنا چاہیئے جس میں عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جائیگا۔ سائنس دانوں کی عقل نے جنگ کا کام سپاہیوں سے چھین کر کیمیاوی مرکبات اور بے روح آلات کے سپرد کر دیا ہے جو مقاتل (Combatants) اور غیر مقاتل (Non-Combatants) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ اب محارب طاقتوں کی لڑائی میدانوں اور قلعوں میں نہیں بلکہ شہروں اور بستیوں میں ہوگی کیونکہ جدید نظریہ کے مطابق غنیم کی اصلی قوت فوجوں میں نہیں بلکہ اس کی آبادیوں، اس کی تجارتی منڈیوں اور صنعتی کارگاہوں میں ہے۔ اب ہوائی جہازوں سے طرح طرح کے بم

---

[1] الانعام۔ ۶۵۔

برسائے جائیں گے جن سے آتش فشاں مادے، زہریلی ہوائیں، امراض کے جراثیم نکل کر وقت واحد میں ہزاروں لاکھوں کی آبادی کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ان میں سے ایک قسم کے بم (Lewisite Bombs) ایسے ہیں جن کا ایک گولہ لندن کی بڑی سے بڑی عمارت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے[1]۔ ایک زہریلی ہوا (Green cross gass) کے نام سے موسوم ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو سونگھے گا وہ ایسا محسوس کرے گا کہ گویا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ ایک دوسری قسم کی زہریلی ہوا (Yellow cross gass) میں سانپ کے زہر کی سی خاصیت ہے اور اس کے سونگھنے سے بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں جو سانپ کے کاٹنے سے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی بارہ زہریلی ہوائیں اور بھی ہیں جو تقریباً غیر مرئی ہیں۔ ان کے اثرات ابتداءً بالکل محسوس نہیں ہوتے اور جب محسوس ہوتے ہیں تو تدبیر علاج کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ ان میں سے ایک خاص ہوا ایسی ہے جو بہت بلندی پر پہنچ کر پھیل جاتی ہے اور جو ہوائی جہاز اس کے حلقہ سے گزرتا ہے اس کا چلانے والا یکایک اندھا ہو جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بعض زہریلی ہوائیں اگر ایک ٹن کی مقدار میں شہر پیرس پر چھوڑ دی جائیں تو ایک گھنٹہ کے اندر کلیۃً تباہ کیا جا سکتا ہے اور یہ ایسا کام ہے جس کو انجام دینے کے لیے صرف تنلو ہوائی جہاز کافی ہیں۔

حال میں ایک برقی آتش فشاں گولہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ایک

---

[1] بعد میں اس سے بدرجہا زیادہ خطرناک چیز ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد ہو گئے اور ہیروشیما اور ناگاساکی میں انہوں نے اپنے کمالات کا ایک چھوٹا سا نمونہ دکھا دیا۔

کیلوگرام ہوتا ہے مگر اتنے سے گولے میں یہ قوت ہے کہ جب کسی چیز سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو دفعتہً تین ہزار درجہ فارن ہیٹ کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو کسی چیز سے بجھائی نہیں جاسکتی۔ پانی اس کے حق میں پٹرول ثابت ہوا ہے اور ابھی تک سائنس اس کے بجھانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کر سکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان کو شہروں کے بڑے بڑے بازاروں پر پھینکا جائے گا تاکہ اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے۔ پھر جب لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگیں گے تو ہوائی جہازوں سے زہریلی ہواؤں کے بم برسائے جائیں گے جن سے تباہی کی تکمیل ہو جائے گی۔

ان ایجادات کو دیکھ کر ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ چند ہوائی جہازوں سے دنیا کے بڑے سے بڑے اور محفوظ دارالسلطنت کو دو گھنٹوں میں پیوند خاک کیا جاسکتا ہے۔ لاکھوں کی آبادی کو اس طرح مسموم کیا جاسکتا ہے کہ رات کو اچھے خاصے سوئیں اور صبح کو ایک بھی زندہ نہ اُٹھے۔ زہریلے مادوں سے ایک پورے ملک میں پانی کے ذخائر کو مسموم، مواشی اور حیوانات کو ہلاک، کھیتوں اور باغوں کو غارت کیا جاسکتا ہے۔ ان تباہ کن حملوں کی مدافعت کا کوئی مؤثر ذریعہ ابھی ایجاد نہیں ہوا ہے بجز اس کے کہ دونوں محارب فریق ایک دوسرے پر اسی طرح حملے کریں اور دونوں ہلاک ہو جائیں۔

یہ آئندہ جنگ کی تیاریوں کا ایک مختصر بیان ہے اگر آپ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں تو کتاب (What woutd Be The Character of A New War) ملاحظہ کیجئے جو جنیوا کی انٹر پارلیمنٹری یونین نے

باقاعدہ تحقیقات کے بعد شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ اندازہ کر لیں گے کہ مغربی تہذیب نے کس طرح اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے، اب اس کی عمر کا امتداد صرف اعلانِ جنگ کی تاریخ تک[1] ہے۔ جس روز دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ چھڑی اسی روز سمجھ لیجیے کہ مغربی تہذیب کی تباہی کے لیے خدا کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ کیونکہ دو بڑی سلطنتوں کے میدان میں اترنے کے بعد کوئی چیز جنگ کو عالمگیر ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ اور جب جنگ عالمگیر ہو گی تو تباہی بھی عالمگیر ہو گی

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ
لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم۔ رکوع ۵)

لوگوں کے اپنے ہاتھوں کئے ہوئے کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد رونما ہو گیا ہے
تاکہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ شاید وہ اب بھی رجوع کریں۔

بہرحال اب قریب ہے کہ وراثتِ ارضی کا نیا بندوبست ہو اور ظالمین و مسرفین کو گرا کر کسی دوسری قوم کو (جو غالباً مستضعفین ہی میں سے ہو گی) زمین کی خلافت پر سرفراز کیا جائے۔ دیکھنا ہے کہ اس مرتبہ حضرت حق کی نظرِ انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آئندہ کونسی قوم اٹھائی جائے گی

---

[1] دوسری جنگ کے دوران ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کیا کچھ ہوا، اس کا ایک نمونہ ناگاساکی کی تباہی میں دیکھا جا سکتا ہے اور زیادہ تفصیل سے دیکھنا ہے تو لارڈ رسل کی کتاب (Scourge of Swastika) میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ایک بے خدا تہذیب ایک قوم کی قوم کو بھیڑیوں سے بھی لاکھ گنا بدتر درندے بنا دیتی ہے۔

یہ اللہ کی دین ہے جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ مگر اس معاملہ میں بھی اس کا ایک قانون ہے جسے اس نے اپنی کتاب عزیز میں بیان فرما دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کو جب وہ اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے گراتا ہے تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس مغضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند سرکش نہ ہو۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔

اگر تم نے روگردانی کی تو تمہارے بجائے کسی اور قوم کو اٹھائے گا پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو کمزور اور مغلوب النفس قومیں مغربی تہذیب کی نقالی کر رہی ہیں اور فرنگی اقوام کے محاسن کو (جو تھوڑے بہت ان میں باقی رہ گئے ہیں) اختیار کرنے کے بجائے ان کے معائب کو اختیار کر رہی ہیں (جو ان کے مغضوب ہونے کی علت ہیں) ان کے لیے آئندہ انقلاب میں کامیابی و سرفرازی کا کوئی موقع نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ - اکتوبر ۱۹۳۲ء)

لارڈ لوتھین کا خطبہ

جنوری کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) کے موقع پر لارڈ لوتھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ (جدید اور قدیم دونوں) اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبہ میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے جس نے علوم جدیدہ اور ان کی پیدا کردہ تہذیب کو دور سے نہیں دیکھا ہے بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں جنم لیا ہے اور اپنی زندگی کے ۵۷ سال اسی سمندر کی غواصی میں گزارے ہیں۔ وہ پیدائشی اور خاندانی یورپین ہے، آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، "راونڈ ٹیبل" جیسے مشہور رسالے کا ایڈیٹر رہ چکا ہے اور قریب قریب ۱۱ سال سے سلطنت برطانیہ کے مہمات امور میں ذمہ دارانہ حصہ لیتا ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے اور وہ ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس گھر میں اصل خرابیاں کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں اور اس کے گھر کے لوگ اس وقت درحقیقت کس چیز کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

ایک حیثیت سے یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے کیونکہ اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور ان کی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق ہی تریاق نہیں ہے بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس

معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا۔ یہ ہمیں تباہی کے کنارے پہنچا چکی ہے اور تمہیں بھی تباہ کر کے رہے گی۔ ہم خود ایک تریاقِ خالص کے محتاج ہیں۔ اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور ہوتا ہے کہ وہ تریاق تمہارے پاس موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر ہماری زہر آلود معجون کے مزے پر لگ جاؤ۔

دوسری حیثیت سے اس خطبہ میں ہمارے علماء اور مذہبی طبقوں کے لیے بھی کافی سامانِ بصیرت ہے۔ اس سے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ اس وقت جس دنیا میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے سامنے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کئی صدیوں سے مادہ پرستی کی تہذیب کا تجربہ کر رہی ہے اور اب اس سے تھک چکی ہے۔ صدیوں پہلے روحِ تحقیق اور آزادیٔ فکر کا جو تریاق ہم نے اہلِ فرنگ کو بہم پہنچایا تھا، اس کو خود انہوں نے محض نادانستگی میں لامذہبی اور مادیت کے زہر سے آلود کر دیا اور دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی معجون تیار کی۔ اس معجون کا تریاق اپنے زور سے انہیں ترقی کے آسمان پر اٹھا لے گیا، مگر اس کا زہر بھی برابر اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اب اس تریاق پر زہر کا اثر پوری طرح غالب ہو چکا ہے۔ اس کے تلخ نتائج کو خوب اچھی طرح بھگت لینے کے بعد اب وہ پھر تریاق کی مزید خوراک کے لیے چاروں طرف نظر دوڑا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی معجون میں زہریلے اجزاء کون کون سے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان اجزاء کے ملنے سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

وہ اب یہ بھی صاف طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ ان اثرات کو دور کرنے کے لیے کس قسم کا تریاق انہیں درکار ہے۔ مگر صرف یہ بات ان کو معلوم نہیں کہ جس تریاق کے وہ طالب ہیں، وہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں ہے اور یہ آخری خوراک بھی ان کو اسی دواخانہ سے ملے گی جہاں سے پہلی خوراک ملی تھی۔ اس مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد بھی اگر وہ تریاق کے لیے بھٹکتے رہیں اور اسے نہ پاکر زہر سے ساری دنیا کو مسموم کیے چلے جائیں، تو اس گناہِ عظیم میں ان کے ساتھ علماء اسلام بھی برابر کے شریک ہوں گے۔ علماء کے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات اور فقہی جزئیات کی بحثوں میں لگے رہیں۔ رسول اللہؐ کو علمِ غیب تھا یا نہ تھا؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسول کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصالِ ثواب اور زیارتِ قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آمین بالجہر و رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ مسجد میں منبر و محراب کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جاتا ہے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل جن کو طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایانِ دین اپنی ساری قوتیں ضائع کر رہے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم الشان لڑائی کا تصفیہ نہیں ہو سکتا جو اس وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصلی ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے جو ناخدا شناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم اور تمدن کے صدیوں تک نشوونما پاتے رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصولِ اسلام کے مطابق ان کا قابلِ عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علمائے اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا، اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ اور امریکہ کا جو حشر ہو گا سو ہو گا

خود دنیائے اسلام بھی تباہ ہو جائے گی۔ کیونکہ وہی مسائل جو مغربی ممالک کو درپیش ہیں، تمام مسلم ممالک اور ہندوستان میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی صحیح حل بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم سب کے سب ان لوگوں کے الٹے سیدھے نسخے استعمال کرتے چلے جا رہے ہیں جو خود بیمار ہیں۔ اب یہ معاملہ صرف یورپ اور امریکہ کا نہیں بلکہ ہمارے اپنے گھر اور ہماری آئندہ نسلوں کا ہے۔

ان وجوہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علماء دونوں لارڈ لوتھین کے اس خطبے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ بیچ بیچ میں حسب ضرورت ہم مطالب کی تشریح کرتے جائیں گے تاکہ مغز کلام تک پہنچنے میں مزید سہولت ہو۔

لارڈ لوتھین اپنی بحث کی ابتداء اس طرح کرتے ہیں:-

"ایک اور امر تنقیح طلب ہے جس کی طرف آج میں آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ کیا ہندوستان دورِ جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ اور امریکہ آج کل مبتلا ہیں؟

مغرب میں حکمتِ جدید سے دو بڑے نتیجے رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے فطرت اور اس کی طاقتوں پر انسان کی دسترس کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ دوسری طرف اس نے یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں میں اور عموماً ساری دنیا میں متوارث مذہب کے اقتدار کو کمزور کر دیا۔ دنیائے جدید کی کم از کم آدھی خرابیاں انہی دو اسباب سے پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیب یافتہ آدمی ان طاقتوں کے نشے سے چور

ہو گیا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کر دی ہیں۔ مگر اس نے علم اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاص میں مساوی ترقی نہیں کی جو اس بات کی ضامن ہو سکتی تھی کہ یہ طاقتیں انسان کی تباہی کے بجائے اس کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں"۔

اس تمہید میں فاضل خطیب نے دراصل انسانی تہذیب و تمدن کے بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سائنس مجرد سائنس ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ تحقیق، اجتہاد اور تلاش و تجسس کی ایک لگن ہے جس کی بدولت انسان کو عالم طبیعی کی چھپی ہوئی قوتوں کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ ان سے کام لینے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ اس علم کی ترقی سے جو نئی طاقتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے لگتا ہے تو یہ تمدن کی ترقی کہلاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں بجائے خود انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہیں۔ یہ جس طرح فلاح کی موجب ہو سکتی ہیں اسی طرح تباہی کی موجب بھی ہو سکتی ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگا، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل اور موٹر اور بحری و ہوائی جہازوں پر دوڑنے لگا، ڈاک چوکیوں کے بجائے اگر تار برقی اور لاسلکی سے خبر رسانی ہونے لگی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان پہلے سے زیادہ خوشحال ہو گیا۔ ان چیزوں سے جس قدر اس کی خوشحالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر اس کی مصیبت اور تباہی بھی بڑھ سکتی ہے، کیونکہ جس دورِ تمدن میں انسان کے پاس صرف تیر و شمشیر کے آلات تھے، اس کے مقابلہ میں وہ تمدن بدرجہا زیادہ مہلک ہو سکتا ہے جس میں اس کے پاس مشین گنیں اور زہریلی گیسیں،

ہوائی جہاز اور تحت البحر کشتیاں ہوں۔ ترقی علم و تمدن کے موجب فلاح یا موجب ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جس کے زیر اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقا ہوتا ہے۔ ارتقا کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ طاقتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے۔ یہی انسان اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت طے کرتی ہے، یہی اجتماعی زندگی کے اصول اور شخصی، قومی اور بین الاقوامی معاملات کے اخلاقی قوانین بناتی ہے اور فی الجملہ یہی چیز انسان کے ذہن کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے کہ علم کی ترقی سے جو طاقتیں اس کو حاصل ہوں انہیں اپنے تمدن میں کس صورت سے داخل کرے، کس مقصد کے لیے اور کس طرح ان کو استعمال کرے، مختلف استعمالات میں سے کن کو ترک اور کن کو اختیار کرے، عالم طبیعی (Physical World) کے مشاہدات اور قوانین طبیعی کے معلومات بجائے خود کسی اعلیٰ تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتے، کیونکہ ان کی رو سے تو انسان کی حیثیت ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ نہیں ہے، ان کی مدد سے صرف وہی نظریہ حیات قائم کیا جا سکتا ہے جو مادہ پرستوں کا نظریہ ہے، یعنی یہ کہ انسان کے لیے زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی میں اپنی حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنا اس کا منتہائے مقصود ہے اور کائنات میں جو تنازع للبقا اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون جاری ہے، اس سے ہم آہنگ ہو جانا اور گرد و پیش کی تمام مخلوقات کو کچل کر خود سب پر غالب ہو جانا ہی طاقت کا اصلی مصرف ہے۔ یورپ نے جو تہذیب اختیار کی وہ اسی نظریہ حیات پر مبنی تھی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تمدن کی ترقی نے انسان کو جس قدر طاقتیں بہم پہنچائیں وہ

سب انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کی تباہی کے راستہ میں صرف ہونے لگیں۔ اب خود یورپ والوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ ان کو حیوانی تہذیب سے بلند تر ایک انسانی تہذیب کی ضرورت ہے اور اس تہذیب کی اساس مذہب کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔

آگے چل کر لارڈ لوتھین فرماتے ہیں:-

"سائنٹفک اسپرٹ (روحِ تحقیق) نے یہ تو ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ پرانے توہمات کو دور کر دیا، علم کے دائرے کو پھیلا دیا اور اسی طرح مردوں اور عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کر دیا جن میں وہ پہلے جکڑے ہوئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی اور مذہبی صداقت کا شدت کے ساتھ حاجت مند بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ فراہم نہ کیا۔ اکثر اہل مغرب کا یہ حال ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتاری اور عجوبہ گری اور حواس کی لذتوں کے شوق میں منہمک ہیں، سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ان سے سلب ہو گئی ہے اور عملاً ان کا کوئی ربط اس لامحدود ازلی و ابدی حقیقت سے باقی نہیں رہا ہے جسے مذہب پیش کرتا ہے۔"

مذہب جو انسان کا ناگزیر رہنما، اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد، شرف اور معنویت حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی مسلکوں کی گرویدہ ہو گئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اس صورت

پر ایمان لے آتی ہے جو محض مادی ترقی کو منتہا ئے مقصود قرار دیتی اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ اور گراں بار بناتے چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی اس کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کے لیے اپنی روح اور اپنی زندگی میں اس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو موجودہ دور کی سب سے بڑی مصیبت نیشنلزم سے نجات دلاتے۔"

اس کے بعد لارڈ لوتھین نے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا ہے:۔

"کیا ہندوستان کے دو بڑے مذہب ہندوازم اور اسلام، جدید دور کی تنقیدی اور تحقیقی روح کا مقابلہ مغرب کی مذہبی مسیحیت کی بہ نسبت زیادہ کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے؟ یہ اہم ترین سوال ہے اور اگر ہندوستان کو ان مصائب سے بچانا ہے جو مغرب پر نازل ہو چکے ہیں تو اس ملک کے علمی اور مذہبی لیڈروں کو اسی سوال پر توجہ مرکوز کر دینی چاہیئے۔ اس میں تو شک نہیں کہ روحِ تحقیق رفتہ رفتہ توہم اور جاہلیت کے ان عناصر کو فنا کر دے گی جو اب تک ہندوستان کے عوام میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ بہت اچھا ہوگا، مگر کیا یہ چیز دونوں مذہبوں کے اصول اخلاق اور روحانیت کو بھی ان لوگوں کے دل و دماغ سے نکال دے گی جو آگے چل کر ہندوستان کی سیاسی، تمدنی اور صنعتی زندگی کے لیڈر بننے والے ہیں؟ میں ہندوازم اور اسلام کی اندرونی زندگی سے واقفیت کا مدعی نہیں ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے عناصر رکھتے ہیں

جو ان میں سے ہر ایک کو یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے مردوں اور عورتوں پر قابو رکھنے کے قابل بنا سکیں گے۔ عیسائیت تو اپنی بعض ایسی غلط اعتقادی بندشوں کی وجہ سے اس میں ناکام ہو چکی ہے جنھوں نے اس مذہب کے جلیل القدر ربانی کی پیش کردہ صداقتوں کو چھپا لیا"

جیسا کہ لارڈ لوتھین نے خود اعتراف کیا ہے، حقیقتاً ان کو ہندوازم اور اسلام کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ انھوں نے محض دور سے دیکھ کر چند چیزیں ہندو مذہب میں اور چند اسلام میں ایسی پائی ہیں جو ان کے نزدیک جدید تنقید و تحقیق کی روح کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کو اخلاق و روحانیت کے بلند تر اصولوں پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو لوگ ان دونوں مذاہب، بلکہ ہندوستان کے تمام مذاہب کا اندرونی علم رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روح تنقید و تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب ٹھہر سکتا ہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں، اگر کوئی مذہب اس روح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو لے کر آگے بڑھ سکتا ہے اور ترقی و روشنی کے دور میں پوری نوع انسانی کا مذہب بن سکتا ہے، تو وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت کیوں ناکام ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ کوئی اجتماعی (Social) مسلک نہیں ہے بلکہ اجتماعیت کی عین نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات سے بحث ہے اور اس کی نجات کا راستہ بھی اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ دنیا سے منہ موڑ کر اپنا رُخ آسمانی بادشاہت کی طرف پھیر لے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی قوموں نے ترقی کے راستہ پر قدم بڑھایا تو مسیحیت ان کی مددگار ہونے کے بجائے مزاحم ہوئی اور انہیں اس کی بندشیں توڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اسی سے

ملتا جلتا حال ہندوازم کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی ترقی پرور فلسفہ اور کوئی معقول قانونِ اخلاق، اور کوئی وسعت پذیر نظام اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے اب تک ہندوؤں کو ایک سوشل سسٹم میں باندھے رکھا ہے اور دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کرنے سے روکا ہے وہ ان کا ورن آشرم (Caste system) ہے۔ مگر موجودہ دور کی روحِ تنقید و تحقیق کے سامنے اس بندھن کا ٹوٹنا یقینی ہے اور یہ ٹوٹ کر رہے گی۔ اس کے بعد کوئی چیز ہندو سوسائٹی کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکے گی اور اس کے مقفل دروازے، بیرونی اثرات کے لیے چوپٹ کھل جائیں گے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں کے قدیم قوانین معاشرت و تمدن اور ان کے پرانے بت پرستانہ توہمات اور ان کے غیر عقلی اور غیر علمی فلسفیانہ قیاسات، دورِ جدید کی علمی ترقی اور اجتماعی بیداری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اب ہندو روز بروز ایک ایسے دوراہے کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں جہاں ان کی اور بڑی حد تک تمام ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو وہ اسلام کے خلاف اسی تعصب میں گرفتار رہیں گے جس میں یورپ کی نشاۃ جدیدہ (Rennaissance) کے موقع پر یہی اہلِ یورپ گرفتار تھے اور اسی طرح اسلام سے منحرف ہو کر مادہ پرستانہ تہذیب کا راستہ اختیار کریں گے جس طرح اہلِ یورپ نے اختیار کیا۔ یا پھر فوج در فوج اسلام میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔

اس فیصلہ کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں اور خصوصاً ان کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے طرزِ عمل پر ہے۔ اسلام اپنے نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ اس کے اصول اگر محض کتاب میں لکھے رہیں تو ان سے بھی کسی معجزے کا صدور

ممکن نہیں۔ جس انتشار اور بے عملی کی حالت میں مسلمان اس وقت مبتلا ہیں، جو جمود ان کے علماء پر طاری ہے اور جس زنانہ انفعال و تاثر کا اظہار ان کی نئی تعلیم یافتہ نسلوں سے ہو رہا ہے، اس سے ہندوستان کی روح کو فتح کرنا تو درکنار، یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اسلام کے نام لیوا خود اپنی جگہ ہی پر قائم رہ جائیں گے، انقلاب کے تیز رو سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا غیر ممکن ہے۔ یا اس کو رو میں بہنا پڑے گا، یا پوری مردانگی کے ساتھ اُٹھ کر سیلاب کا منہ پھیر دینا ہوگا۔ یہ دوسری صورت صرف اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ اوّل تو عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح پھونک دی جائے۔ دوسرے علمائے اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصولِ اسلام کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور علمی و عملی دونوں صورتوں میں ان کو اس طرح حل کر کے بتائیں کہ اندھے متعصبین کے سوا ہر معقول انسان کو تسلیم کرنا پڑ جائے کہ ایک ترقی پذیر تمدن کے لیے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں مذہب[1] اور سائنس کی نزاع کا وہ تصور اب تک چلا جا رہا ہے جو یورپ میں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھا۔ لیکن یورپ میں نقشہ بدل چکا ہے اور یورپ کا پس خوردہ کھانے والے ہندوستان میں بھی عنقریب نقشہ بدل جانے

---

[1] واضح رہے کہ یہ مضمون ۱۹۳۸ء کا لکھا ہوا ہے جب ہندوستان و پاکستان الگ الگ نہ ہوئے تھے جن مسائل کا ذکر اس وقت ہندوستان کی نسبت کیا گیا تھا وہی اب ان دونوں ملکوں کو درپیش ہیں۔ جو تقسیم کے بعد وجود میں آئے۔

والا ہے۔ لہٰذا وہ وقت قریب آ رہا ہے جب مذہب کے "خلاف کم از کم علمی اور عقلی حیثیت سے یہ تعصب باقی نہ رہے گا۔ بشرطیکہ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔ اس حقیقت کی طرف لارڈ لوتھین نے مختصر الفاظ میں یوں اشارہ کیا ہے:۔

"ساٹھ برس پہلے سائنس اور مذہب میں ایسا معرکہ جاری تھا۔ جس کے ختم ہونے کی توقع نہ تھی۔ زندگی کے روحانی تصور اور مشینی تصور کے درمیان ایسی جنگ برپا تھی جس کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم نہ ہوگی۔ مگر آج دونوں فریقوں نے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ نہ سائنسداں، اور نہ دیندار، دونوں میں سے کوئی بھی آج اس تحکم کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، بلکہ درحقیقت دل میں دونوں کے یہ شبہ پیدا ہو چکا ہے کہ آیا وہ اس معمہ کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں لہٰذا اب ایک ایسے امتزاج کا امکان ہو چکا ہے جو تحقیق علمی کے نئے نئے زور شور میں غیر ممکن نظر آتا تھا۔"

لارڈ لوتھین بہرحال مذہب کے مسیحی تصور سے آزاد نہیں ہیں اور مذہب کا وہ عقلی تصور ان تک پہنچا ہی نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہی سوچ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اب کوئی امتزاج ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم مذہب و سائنس کے امتزاج کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو حقیقی مذہب وہ ہے جو سائنس کی روح، اس کی رہنما طاقت بن جائے۔ اسلام درحقیقت ایسا ہی مذہب ہے اور آج اس کو سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز

رد کیے ہوتے ہے تو وہ اس کا اپنا اندرونی نقص نہیں ہے بلکہ اس کے علمبرداروں کی غفلت اور موجودہ سائنس کے علمبرداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔ یہ دو اسباب دور ہو جائیں، پھر یہ سائنس کے قالب میں جان ہی بن کر رہے گا۔

آگے چل کر فاضل خطیب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ موجودہ دور کی علمی بیداری اور عقلی تنقید کے سامنے کس قسم کا مذہب ٹھہر سکتا ہے؟ انسان اس روشنی کے عہد میں جس مذہب کا طلب گار ہے اس کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں؟ اور اس وقت انسان کی اصلی حاجات کیا ہیں جن کے لیے وہ مذہب کی رہنمائی ڈھونڈھ رہا ہے؟ یہ اس خطبہ کا سب سے زیادہ قابلِ توجہ حصہ ہے:۔

"اگر میں صورتِ حالات کا غلط اندازہ نہیں کر رہا ہوں تو یہ حقیقت ہے کہ جو امتحان اس وقت مذہب کو درپیش ہے، اس سے وہ صرف اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ گزر سکتا ہے جب کہ نوخیز نسل اس کے اندرونی نظام کی جانچ پڑتال کر کے اس امر کا پورا اطمینان کر لے کہ زندگی میں جن عملی مسائل اور جن پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا بہترین حل اس مذہب میں موجود ہے۔ شخصی مذہب کا دور اب گزر چکا ہے۔ محض جذباتی مذہب کی بھی اب کسی کو حاجت نہیں۔ اس قسم کے مذہب کا زمانہ بھی اب نہیں رہا جو فرد کو صرف اس حد تک تسلی اور سہارا دے سکتا ہو کہ اس کے اخلاقی طرزِ عمل کے لیے کچھ ہدایات دے دے اور ایک ایسی نجات کی امید دلا دے جس کا حال مرنے کے بعد ہی کھل سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا سائنٹیفک آدمی تو ہر چیز کو، حتیٰ کہ خود

صداقت کو بھی ہین نتائج کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو مذہب کا اتباع کرنا ہے تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اس کو یہ بتائے کہ وہ اس کی زندگی کے عملی مسائل کا اپنے پاس کیا حل رکھتا ہے۔ بہت سے جنموں کے بعد آخرکار نروان حاصل ہونے کی امید یا موت کے دروازے سے گزر جانے کے بعد آسمانی بادشاہت میں پہنچ جانے کی توقع ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف اسی کی بنیاد پر وہ مذہب کو قبول کرے۔ اس کی فلسفیانہ جستجو کے لیے مذہب کو سب سے پہلے تو وہ کلید فراہم کرنی چاہیئے جس سے وہ کائنات کے معمے کا کوئی قابلِ اطمینان حل پا سکے۔ پھر اسے ٹھیک ٹھیک سائنٹیفک طریقہ پر علت اور معلول، سبب اور نتیجہ کا بین تعلق ثابت کرتے ہوئے یہ دکھانا چاہیئے کہ انسان ان طاقتوں کو کس طرح قابو میں لاتے جو اس وقت بے قابو ہو کر نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے تباہ کر دینے کی دھمکیاں دے رہی ہیں اور کس طرح وہ بے روزگاری، غیر معقول عدم مساوات، ظلم و ستم، معاشی لوٹ، جنگ، اور دوسری اجتماعی خرابیوں کا انسداد کرے اور افراد کی باہمی کشمکش اور خاندانی نظام کی برہمی کو کس طرح روکے جس نے انسان کی مسرتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

انسان آج صرف اس وجہ سے مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے کہ سائنس نے اس کی مشکلات کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا ہے، اس لیے وہ مذہب سے اپنے شکوک اور اپنی مشکلات کا حل طلب کرنے میں اتنا بے چین ہے جتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ اب اگر مذہب اپنے مقام

کی حفاظت اور اپنے کھوتے ہوتے میدان کی بازیافت چاہتا ہے تو اسے
ان سوالات کا روحانی مگر سائنٹیفک جواب دینا چاہیئے جس کی صحت کو
نتائج کے معیار پر اسی دنیا میں جانچا اور پرکھا جا سکے موت کے بعد دوسری
دنیا پر نہ انتظار کھا جائے۔ ہم اہل مغرب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا سوال
ہے جو ہمارے اس دور میں سامنے آیا ہے۔ کیا آپ ہندوستان میں اس
کا جواب دے سکتے ہیں؟"

لارڈ لوتھین کی تقریر کا یہ حصہ پڑھتے وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی
پیاسا ہے جسے پانی کا علم تو نہیں مگر وہ اپنی پیاس کی کیفیات کو ٹھیک محسوس
کر رہا ہے اور بتاتا جاتا ہے کہ میرے جگر کی آگ کوئی ایسی چیز مانگتی ہے جس میں
یہ صفات موجود ہوں۔ اگر پانی اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو اس کی فطرت
فوراً پکار اٹھے گی کہ جس چیز کا وہ پیاسا ہے وہ یہی چیز ہے اور لپک کر اسے منہ
سے لگا لے گا۔ یہ حال صرف ایک لارڈ لوتھین ہی کا نہیں ہے بلکہ یورپ اور امریکہ
اور تمام دنیا میں جو لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکے ہیں
اور فلسفہ و سائنس کے صحرا میں کنارے کی شادابیوں سے گزر کر وسط کی بے آب و گیاہ
پہنائیوں تک پہنچ چکے ہیں، ان سب کو آج یہی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ سب
انہی صفات کی ایک چیز مانگ رہے ہیں جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے اور ان
سب کا یہی حال ہے کہ پانی کا نام نہیں جانتے، یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں پایا
جاتا ہے۔ مگر رہ رہ کر پکارتے ہیں کہ

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا!

پانی کا نام انھوں نے سُنا تو ضرور ہے مگر اس نام سے یہ محض اس لیے گھبراتے ہیں کہ اصل شے کو انھوں نے خود دیکھا نہیں ہے اور اپنے جاہل و متعصب اسلاف سے سنتے بھی چلے آر ہے ہیں کہ خبردار پانی کے پاس نہ پھٹکنا، یہ ایک بڑی زہریلی چیز کا نام ہے۔ لیکن اب یہ اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نام کو چھپا کر نفس شے کو ان کے سامنے رکھ دیا جاتے تو بے اختیار کہہ دیں گے کہ ہاں ٹھیک یہی وہ چیز ہے جس کے ہم پیاسے ہیں۔ اس کے بعد جب انہیں بتایا جاتے گا کہ حضرت، یہ وہی "پانی" ہے جس کے نام سے آپ گھبراتے تھے تو حیرت سے ان کا منہ کھلا رہ جاتے گا اور کہیں گے کہ کیسا دھوکا تھا، جس میں ہم مبتلا تھے۔

موجودہ زمانے کا "سائنٹیفک آدمی" عیسائیت کو خوب چکھ اور پرکھ چکا ہے، اور یہ بات اس پر روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وہ اس کے مرض کی دوا نہیں ہے۔ ہندوازم اور بدھ ازم کے خیالی فلسفوں اور ان کی تاریخی قدامت پرستی کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی ان سے مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر سائنٹیفک تنقید و تحلیل کے پہلے ہی امتحان میں ان کی ناکامی کمل کر رہتی ہے۔ بدھ مت تو قریب قریب عیسائیت کا بھارتی ایڈیشن ہے۔ رہا ہندوازم تو وہ خود ان مشکلات اور پیچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے جن سے نکلنے ہی کے لیے موجودہ زمانے کا سائنٹیفک آدمی مذہب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ انسان اور انسان میں غیر معقول نامساوات سب سے زیادہ اسی کے دائرہ میں پائی جاتی ہے، معاشی لوٹ کی سب سے بدتر صورت، یعنی مہاجنی وسودخواری اس کے سسٹم کا ایک غیر منفک جز بن چکی ہے۔ جنگ کی اصلی وجہ یعنی انسان کی نسلی تقسیم اور نسلی منافرت اس کی عین اساس میں پیوست ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے جو نظام

اس نے قائم کیا ہے وہ انسانوں کو ملانے والا نہیں بلکہ بے شمار طبقوں اور گوتروں میں تقسیم کرنے والا ہے، اس کے قوانین معاشرت اتنے بوسیدہ ہیں کہ موجودہ علمی و عملی بیداری کے دور میں خود ہزاروں برس کے خاندانی ہندوان قوانین کو توڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد علم اور عقل پر نہیں بلکہ تعصبات اور توہمات پر ہے۔ ان دنیوی مسائل سے اُوپر، اخلاقیات اور الہیات کے دائرے میں وہ اس سے بھی زیادہ ناقص پایا جاتا ہے۔ کائنات کے معمے کو اطمینان بخش طریقے پر حل کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی کلید نہیں۔ اس کے عقائد اذعانی عقائد ہیں، علمی یا عقلی ثبوت ان میں سے کسی چیز کا نہیں دیا جا سکتا۔ اخلاقیات میں وہ دل خوش کن مفروضات کا ایک طلسم ضرور بناتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ایک طلسم مہاتما گاندھی نے بنا رکھا ہے مگر معقولات اور حکمتِ عملی (Practical Wisdom) سے اس کا دامن خالی ہے، موجودہ علمی بیداری کے دور میں اس کی ناکامی اگر کھلی نہیں تو عنقریب کھل جائیگی۔

اس کے بعد میدان میں صرف اسلام رہ جاتا ہے، اور وہی ان معیاروں میں سے ایک ایک معیار پر پورا اترتا ہے جو آجکل کا "سائنٹفک آدمی" اپنے مذہب مطلوب کے لیے پیش کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے اور محض انفرادی ضمیر ہی سے اس کا تعلق ہے اب ایک فرسودہ بات ہو چکی ہے۔ یہ انیسویں صدی کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک تھی، جسے بیسویں صدی کی اس چوتھی دہائی میں بھی ہمارے ملک کے بعض وہ قدامت پسند اب تک رٹتے جا رہے ہیں جو ادعائے تجدد کے باوجود ہمیشہ دنیا سے پچاس برس پیچھے چلنے کے خوگر ہیں۔ اب قریب قریب

یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ فرد کا تصور جماعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص دوسرے سے بے شمار چھوٹے بڑے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے اور سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کا حکم رکھتی ہے جس میں افراد کی حیثیت زندہ جسم کے اعضا کی سی ہے۔ مذہب کی ضرورت اگر ہے تو وہ صرف فرد کو اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی نجات بعد الموت ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی دنیوی زندگی کے سارے کاروبار چلانے کے لیے ہے۔ اور اگر اس چیز کی ضرورت نہیں ہے تو فرد کو بھی نہیں اور جماعت کو بھی نہیں۔ یہ تصور سراسر ایک طفلانہ تصور ہے کہ اجتماعی زندگی کا نظام کچھ اور ہو اور اس نظام سے بے تعلق ہو کر افراد کے مذہبی عقائد اور ان کے مذہبی اعمال کچھ اور ہوں۔ مذہبی عقائد اور مذہبی اعمال کا کوئی ربط اگر اجتماعی زندگی سے نہ ہو تو ایسے عقائد اور اعمال محض بے کار ہیں اور صرف بیکار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام میں ان کا مضمحل ہو جانا یقینی ہے۔ جس کے دوسرے اجزا کے ساتھ وہ تعامل (Inter action) قبول نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا دو صورتوں میں سے لامحالہ کوئی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یا تو پوری جماعت کا نظام سراسر لامذہبی ہو اور مذہب کو قطعی طور پر انسان کی زندگی سے خارج کر دیا جائے جیسا کہ اشتراکیوں کا مسلک ہے، یا پھر اجتماعی نظام پورا کا پورا مذہبی ہو اور علم اور تمدن دونوں کے لیے مذہب کو رہنما تسلیم کیا جائے جیسا کہ اسلام کا مقتضا ہے۔ پہلی صورت کا تجربہ دنیا بہت طویل مدت تک کر چکی ہے۔ اس سے وہی کڑوے پھل پیدا ہو سکتے تھے، وہی پیدا ہوتے اور وہی آئندہ بھی پیدا ہوں گے جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے۔ اب دنیا کی نجات صرف

دوسری صورت میں ہے اور اس کے بروئے کار آنے کے مواقع روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان مواقع سے فائدہ اٹھانا یا ان کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ واقعات کی رفتار دنیا کو، اور دنیا کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے ہمارے ملک کو بھی ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں سے اس کے سفر کا رُخ اسلام کی طرف بھی مڑ سکتا ہے اور مادہ پرستی اور فسادِ اخلاق کے اسفل السافلین کی طرف بھی۔ طبعاً اس کا رُخ ابھی تک دوسرے راستے کی طرف ہے۔ کیونکہ اس راستہ پر دنیا ایک مدت دراز سے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ اس راستے کے مہالک دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہی ہے اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں، مگر بچاؤ کی راہ خود اس کی اپنی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہ درحقیقت اس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو قوت کے ساتھ اٹھ کر اس کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھا دیں اور اسلام کی صراطِ مستقیم کا واحد راہِ نجات ہونا ثابت و مبرہن کر دیں۔ ایک ایسی مجاہد و مجتہد جماعت اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا کے پیشوا بن سکتے ہیں۔ ان کو وہی مقام عزت پھر حاصل ہو سکتا ہے جس پر وہ کبھی سرفراز تھے اور جس پر مغربی قوموں کو متمکن دیکھ کر آج ان کے منہ میں پانی بھر بھر آ رہا ہے۔ لیکن اگر اس قوم کے جمہور اسی طرح دون ہمتی و پست حوصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے، اگر اس کے نوجوان یونہی غیروں کا پس خوردہ کھانے کو اپنا منتہائے کمال سمجھتے رہے، اگر اس کے علماء اپنی پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ بحثوں میں الجھے رہے، اگر ان کے لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکرِ اغیار

کے پیچھے لگ چلنے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمال دانشمندی خیال کریں، غرض اگر اس قوم کے دست و پا سے لے کر دل و دماغ تک سب کے سب تعطل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردانِ خدا بھی جہاد اور اجتہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر باندھ کر نہ اُٹھ سکیں تو پھر دنیا جس اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہے اسی طبقہ جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی دُم کے ساتھ بندھی بندھی جا گرے گی اور غضبِ خداوندی ایک مرتبہ پھر پکارے گا اَلَا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۵۵ھ - مارچ ۱۹۳۶ء)

ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش

خطبات خالدہ ادیب خانم

ترکی کی مشہور فاضل ومجاہد خاتون، خالدہ ادیب خانم اب سے کچھ مدت قبل جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائی تھیں اور انہوں نے دہلی میں چند خطبات ارشاد فرماتے تھے جن کا اردو ترجمہ جامعہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش" کے نام سے کیا ہے۔ ان سطور میں ہم اس مجموعۂ خطبات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں گے۔

دنیائے اسلام میں اس وقت دو ملک ایسے ہیں جن کو دو مختلف حیثیتوں سے مسلمانانِ عالم کی پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ذہنی حیثیت سے مصر اور سیاسی حیثیت سے ٹرکی۔ مصر کے ساتھ اُمم اسلامیہ کے تعلقات نسبتاً زیادہ گہرے ہیں، کیونکہ اس کی زبان ہماری بین الملی زبان "عربی" ہے، اس کا لٹریچر تمام دنیا کے مسلمانوں میں پھیلتا ہے، اس کے ذہنی اثرات چین سے مراکش تک پہنچتے ہیں، اور وہی مسلمانوں کے درمیان ربط اور تفاہم اور واقفیتِ حالات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بخلاف اس کے ترکی قوم کی مجاہدانہ زندگی، اور مغربی تقدمات کے مقابلہ میں اس کی شجاعانہ مدافعت

اور ناموس ملی کے لیے اس کی قربانیوں کا سکہ تو بلاشبہ تمام عالم اسلامی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو مسلمانوں میں سرداری اور پیشوائی کا منصب حاصل ہے، لیکن زبان کی اجنبیت، اور ربط و تفاہم کے فقدان نے ٹرکی اور اکثر ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل کر دیا ہے جس کے سبب سے ترکی قوم کے ذہنی ارتقا اور اس کی دماغی ساخت اور اس کے تمدنی، سیاسی، مذہبی اور علمی تحولات کے متعلق ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ خصوصاً حال کے دس بارہ برسوں میں جو انقلاب ٹرکی میں رونما ہوتے ان کے باطنی اسباب اور ان کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے کا موقع تو ہم کو بہت ہی کم ملا ہے۔ بہت سے لوگ ترکوں سے سخت ناراض ہیں، بعض ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں۔ بعض ان کی مغربیت کو اپنی مغربیت پرستی کیلئے برہان قاطع بنا تے بیٹھے ہیں۔ مگر مستند معلومات کسی کے پاس بھی نہیں ہیں اور جو تھوڑی بہت معلومات ہیں بھی تو وہ ٹرکی جدید کی روح کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس حالت میں ہم اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ خود ٹرکی جدید کے معماروں میں سے ایک ایسی ہستی نے یہاں آکر ہمارے سامنے اپنی قوم کے باطن کو ظاہر کیا ہے جو انقلاب کی اسٹیج پر محض ایکٹر ہی نہ تھی بلکہ اس انقلاب کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت تھی۔ اس کے ساتھ وہ خدا کے فضل سے عالمانہ نظر، اور فلسفیانہ فہم، اور مفکرانہ تعمق بھی رکھتی ہے۔ جس کی بدولت وہ خارجی واقعات کے اندرونی محرکات کو سمجھ بھی سکتی ہے اور سمجھا بھی سکتی ہے۔ ایسے مستند و معتبر ذریعہ سے ہمیں اب پہلی مرتبہ ٹرکی کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے ٹرکی جدید کی روح کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور پوری صداقت و دیانت کے ساتھ ہمیں بتایا

ہے کہ جو قوم آج دنیائے اسلام کی نہ صرف سیاسی رہنمائی کر رہی ہے بلکہ ذہنی رہنمائی کے لیے بھی کوشاں ہے، درحقیقت وہ خود اپنے باطن میں کیا ہے، کن عناصر سے اس کی تعمیر ہوتی ہے، کونسی قوتیں اس میں کام کر رہی ہیں، کون سے اسباب اس کو موجودہ مقام تک پہنچ کر لاتے ہیں اور اب کس رخ پر وہ جا رہی ہے۔ اس کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ ترکی قوم کا حقیقی حال ہم پر روشن ہو گیا، بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ترکی سے جو رہنمائی اب ہماری جدید نسلوں تک پہنچ رہی ہے اس کی روح کو ہم زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور دنیائے اسلام میں جو انقلاب اس وقت رونما ہو رہا ہے اس کے اندرونی اسباب کو سمجھنے کا ایک اور موقع ہم کو مل گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خالدہ خانم کے ذریعہ سے ترکی جدید کو سمجھیں، ہمیں خود ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کا دل پورا پورا مسلمان ہے ایمان سے لبریز ہے، اور ایمان بھی ایسا جس پر ہم کو رشک کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ایک مجاہد عورت کا ایمان ہے[1]۔ الحاد اور بے دینی کا شائبہ تک ان کے خیالات میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام سے ان کو محبت ہے، ویسی ہی محبت جیسی ایک سچی مسلمان عورت کو ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا دل جیسا مسلمان ہے، ان کا دماغ ویسا نہیں ہے۔ انہوں نے تمام تر مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے، مغربی علوم ہی کا مطالعہ کیا ہے، مغربی عینک ہی سے دنیا اور اسلام اور خود اپنی قوم کو دیکھا ہے اور ان کی تمام فکری و نظری قوتیں مغربی سانچے ہی میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی چھپی ہوئی اسلامیت

---

[1] افسوس ہے کہ بعد کے مطالعہ نے مجھ کو اس رائے پر بھی قائم نہ رہنے دیا۔ (۱۹۴۳ء)

اور مشرقیت نے مغربیت کے اس دماغی استیلا کی بہت مزاحمت کی ہے اور اسی مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ ترکی قوم کے دوسرے انقلابی لیڈروں کی بہ نسبت ان کے خیالات میں بہت کچھ اعتدال پایا جاتا ہے، لیکن یہ مزاحمت ان کو مغربیت کے غلبہ سے نہیں بچا سکی ہے۔

اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت کچھ محدود معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن اور سنت نبوی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں انہوں نے شاید اس وقت کا دسواں حصہ بھی صرف نہیں کیا جو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی جو جھلک ہم کو ان کے خطبات میں نظر آتی ہے، اس میں حسن عقیدت تو ضرور موجود ہے، مگر فہم اور تدبر اور بصیرت بہت کم ہے۔

اپنے آخری خطبہ میں وہ فرماتی ہیں کہ گاندھی جی کی ذات "جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے"۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے، جدید اور قدیم کی نسبتوں سے کس قدر بالا و برتر ہے اور اس کا مکمل نمونہ کیسا ہوتا ہے۔ اسلامی سیرت کی خصوصیات پر جس شخص کی نظر ہو اور جس نے اس سیرت کے اصل نمونوں کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو، اس کی نگاہ میں گاندھی جی کی کیا حقیقت ہے، تاریخ عالم کے بڑے سے بڑے ہیرو بھی نہیں جچتے اور یہ کچھ قومی عصبیت کی بنا پر نہیں، ناقابل انکار تاریخی حقائق کی بنا پر ہے۔ ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسینؓ ابن علیؓ، ابوحنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ اور عبدالقادر جیلانیؒ کی سیرتیں سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے دیکھیے کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر تاریخ عالم کی کونسی شخصیت اس قابل ہے کہ ان سیرتوں کے مقابلہ میں لا کر رکھی جا سکے؟

عثمانی قوم کے سیاسی مزاج کی ترکیب میں ان کو ترکی قوم کی قدیم نسلی خصوصیات

سے سے کر یونان، بازنطین، روم، حتیٰ کہ افلاطون کی جمہوریت تک، سب کے اثرات نظر آتے ہیں، مگر نہیں نظر آتے تو قرآن اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اثرات۔ حالانکہ جس چیز نے وسط ایشیا کے بدوی ترکوں کو تہذیب و تمدن سے آشنا کیا اور ان کے اندر جہاں کشائی کے ساتھ جہانبانی کی استعداد پیدا کی اور ان کو نوع انسانی کی ایک تخریبی قوت کے بجائے ایک تعمیری طاقت بنا دیا وہ یہی تعلیم تھی۔ خالدہ خانم زیادہ سے زیادہ اسلام کا جو اثر عثمانیت میں دیکھ سکی ہیں وہ محض اسلامی عدل و مساوات ہے مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ جب سلطان سلیم اپنی رعایا میں بزور شمشیر اسلام کو پھیلانا چاہتا ہے اور شیخ الاسلام جمال آفندی اس کو اس فعل سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے اور سلیم جیسا قہار فرمانروا اس حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہے تو اس عظیم الشان واقعہ میں خالدہ خانم کو اسلامی عدل کے بجائے عثمانی قومیت کا احساس اور عثمانی اصولِ سلطنت کی حمایت کا جذبہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ جمال آفندی کے فتوے میں لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی روح تھی۔ اور وہ اسلامی حق پرستی کی طاقت تھی جس نے سلیم کو اس شرعی فتوے کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔

خالدہ خانم ٹرکی کے موجودہ حکمران طبقہ کی انتہا پسندی، استبدادیت، معاشرت کی جبری تنظیم، حد سے بڑھتی ہوئی مغربیت، مادہ پرستانہ رجحانات اور مذہب کے متعلق اس کی روش سے بیزار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مغربیت اور مشرقیت کا معتدل امتزاج چاہتی ہیں، "مادیت" اور "روحانیت" میں مصالحت کی خواہشمند ہیں، اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ زندگی کے ان دونوں نظریوں میں جو امتزاج اسلام نے پیدا کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے، مگر خود اسلام میں پوری بصیرت نہیں رکھتیں، اس

لیے ان کو معلوم نہیں کہ اصولِ اسلام کے تحت امتزاج کی صحیح صورت کیا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کا خط مستقیم کہاں واقع ہے۔ تاہم اگر ان کی ذاتی آرا سے قطعِ نظر کر کے دیکھا جائے تو ان کے خطبات میں ہم کو ترکی جدید کی ذہنیت اور اس کے رجحانات اور انقلاب کے تاریخی اسباب کا ایک صاف اور صحیح بیان مل جاتا ہے اور وہی ہم کو مطلوب ہے۔

ترکی قوم[1] اسلام میں اس وقت داخل ہوئی جب مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا۔ روحِ جہاد اگرچہ زندہ تھی مگر روحِ اجتہاد مردہ ہو چکی تھی۔ اسلام میں بصیرت رکھنے والے مفکرین اور تفقہ سے بہرۂ وافر رکھنے والے فقہا ناپید تھے۔ تہذیب اسلامی نیم جان اور فکرِ اسلامی قریب بے جان ہو چکی تھی۔ شریعت میں تقلید جامد کا غلبہ تھا۔ تمدن میں عجمیت اور رومیت کے عناصر پیوست ہو چکے تھے۔ تصوف پر اشراقیت کا اور تفکر پر تفلسف کا اثر غالب آ گیا تھا۔ قرآن اور سنت سے براہِ راست اکتسابِ علم کی صلاحیت رکھنے والے مفقود تھے علما زیادہ تر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے کلام کی پیچیدگیوں میں الجھنے والے اور متقدمین کے روندے ہوئے رستوں پر شرح وایضاح کے چھکڑے چلانے والے تھے۔ امرا اکثر و بیشتر قیصر و کسریٰ کے ڈھنگ پر چلنے والے تھے۔ متصوفین اور روحانی پیشوا اسلام کے دورِ اوّل کی حقیقی صوفیت سے بیگانہ اور راہبوں اور جوگیوں کی پیروی کرنے والے تھے۔ علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی۔ تحقیق و اکتشاف کی راہ میں ان کے تقدمات قریب قریب ختم ہو گئے تھے

---

[1] یہاں ترکی قوم سے مراد عثمانی ترک ہیں۔

اور عروج کے بعد زوال کے آثار تمام ممالکِ اسلامیہ میں پیدا ہو چکے تھے۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں ترکوں کی ابتدا ہی ایک بنیادی کمزوری کے ساتھ ہوئی، دولتِ عثمانیہ کا قیام تقریباً اسی زمانہ میں ہوا ہے جب یورپ میں ذہنی ارتقا اور علمی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگرچہ عثمانیوں نے ابتدائی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ کو پیہم شکستیں دے کر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی لیکن اس زمانہ میں عام مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ تنزل کی طرف جا رہے تھے اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوموں سے تھا وہ تیز رفتاری کے ساتھ مادی اور ذہنی ترقی کی راہ پر گامزن تھیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں حالات نے پلٹا کھایا۔ فرنگیوں کی عسکری تنظیم اور مادی و معنوی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے سینٹ گوتھرڈ کے معرکہ میں پہلی مرتبہ تنزل پذیر ترکوں کو نمایاں شکست دی۔ مگر ترکوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ برابر پستی میں گرتے رہے اور فرنگی برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں ترکوں کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی اور تمدنی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی اور فرنگیوں کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کر لیا اور انتظامِ سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرزِ جدید پر عسکری تنظیم، اور جدید مغربی آلاتِ حرب کی ترویج شروع کی۔ لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علما نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے

اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطا اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخرکار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے مقابلہ میں بالکل سینہ بسینہ کھڑے تھے اور برسرپیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے، اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں۔ مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں، ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے، سلطان بے دین ہو گیا ہے اور طرزِ جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لیے خرابیٔ ایمان کا موجب ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کے اہلِ دماغ لوگوں میں اپنی قومی پستی کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے مغربی قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا، ان کے

علوم وآداب کا مطالعہ کیا، ان کی تنظیمات پر گہری نگاہ ڈالی اور اپنی سلطنت کے قوانین انتظامی امور، تعلیمی ادارت اور حربی نظام میں ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جن سے وہ مغربی قوموں کے دوش بدوش ترقی کر سکیں۔ خالدہ خانم کے بقول یہ وہ لوگ تھے جن کی رگ رگ و پے پے میں اسلامیت بیٹھی ہوتی تھی۔ ان کے دل اور دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلہ میں کمتری کا احساس ہرگز نہیں تھا۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ بلا امتیاز اس کی ہر چیز کو قبول کرنے والے نہ تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کر دیں اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ برابر کی مسابقت کر سکیں۔ انہوں نے سلطان عبدالمجید خاں کے زمانہ میں نظام سلطنت کی اصلاح اور فوج کی تنظیم کی۔ اپنی قوم کے ادبیات میں زندگی کی روح پھونکی۔ نئے مدارس اور کالج قائم کئے اور چند سال کے اندر ایک ایسی نسل تیار کر دی جس میں اسلامی تہذیب کے تمام جوہروں کے ساتھ تفکر و تدبر کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد ۱۸۷۶ء تک اس گروہ نے بے شمار خارجی و داخلی مشکلات کے باوجود تعمیر قومی کا بہترین کام انجام دیا اور اس کے ثمرات عمر پاشا جیسے جنرل، مدحت پاشا جیسے مدبر اور نامق کمال اور عبدالحق حمید جیسے سچے مسلمان اہل فکر وادب کی صورت میں ظاہر ہوتے۔

لیکن سلطان عبدالحمید نے آکر دفعۃً حرکت کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک ۳۲ سال کا زمانہ جس میں ایک دوسری مشرقی قوم (جاپان) ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی اس خودغرض سلطان نے محض اپنے شخصی اقتدار کی خاطر

ترکی قوم کی علمی، ذہنی، تمدنی اور سیاسی و تنظیمی ترقی کو روکنے اور اس کی روح کو مردہ کرنے میں صرف کر دیا۔ یہاں موقع نہیں کہ اس شخص کے اعمال پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جا سکے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نے تعمیر کے بہترین زمانے کو جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی، تخریب میں کھو دیا۔ اس نے ترکی قوم کے بہترین دماغوں کو برباد کیا۔ جمال الدین افغانی جیسا بے نظیر آدمی اسے ملا اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کر دیا۔ مگر سب سے بڑا نقصان جو اس کی بدولت نہ صرف ترکی قوم کو بلکہ دنیائے اسلام کو پہنچا وہ یہ ہے کہ اس نے خلافت کے مذہبی اقتدار اور رجعت پسند علماء و مشائخ کے اثرات کو عہدِ تنظیمات کے ترکی مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیڑنے اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقاء کو روکنے اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی اس خود غرضانہ و ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے ترکوں کی نئی نسل میں ایک انقلابی بحران پیدا ہو گیا۔ وہ مذہب کو مانعِ ترقی سمجھنے لگے۔ اسلامیت سے ان کے دماغ منحرف ہو گئے۔ تاریک خیال علماء اور مشائخ سے بجا طور پر جو نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی، انقلابیت کے جوش میں اس کا رُخ مذہب کی طرف پھر گیا۔ وہ سمجھے اور جاہل علماء و مشائخ نے ان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے، زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، اس کے قوانین تغیراتِ احوال کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور بجز چند عقائد کے اس میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی پائیداری رکھتی ہو۔ اس ۳۳ برس کے استبداد نے جو بدقسمتی سے مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا، ترکوں کی نئی نسلوں میں مادہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل مرعوبیت، مغربی تخیلات کی اندھی تقلید، اپنے ماضی سے

نفرت، ہر قدیم چیز سے بیزاری اور خلافت و وحدت اسلامی سے جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنی اغراض کا آلۂ کار بنایا تھا کراہت تام پیدا کردی، اور ان کے اندر یہ خیال راسخ کردیا کہ دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لیے تمام پچھلی بنیادوں کو ڈھا کر بالکل مغربی طرز پر ترکیبت کا قصر تعمیر کرنا ضروری ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور سلطنت کی عنانِ اقتدار منحرف ذہنیت رکھنے والے جوشیلے اور مشتعل نوجوانوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ خالدہ ادیب خانم کے بقول یہ لوگ عہد تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و فکر اور عالی دماغی میں دورِ تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔ نہ ان کے پیش نظر وہ بلند نصب العین تھا، نہ ان کی سیرتوں میں وہ مضبوطی تھی، نہ شائستگی اور تربیت کے لحاظ سے ان کا ان سے کوئی مقابلہ تھا، نہ قومی فخر و ناز کا وہ جذبہ ان میں موجود تھا، نہ تنقید کی وہ صلاحیت تھی کہ قدیم اور جدید کے صحیح فرق کو سمجھ سکیں۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا مجمع تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے، اسلامی تربیت میں ناقص تھے، مغربی علوم میں بھی گہری نظر نہ رکھتے تھے، اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، مغرب کے تفوقات سے مرعوبیت ان کے اندر بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھی اور یہ اپنی ہر چیز کو بدل دینے کے لیے بے چین تھے۔ جب سلطنت ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہ بند پانی جس کو ۳۳ برس کی طویل بندش نے بہت کچھ فاسد کردیا تھا طوفان کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ترکوں پر نیشنلزم اور تورانی عصبیت کا جن

سوار ہوا، وحدت اسلامی کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہونی شروع ہوئی، مذہب پر نکتہ چینی کا آغاز ہوا، قدیم تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر لینے پر زور دیا جانے لگا، ماضی سے تعلق منقطع کرنے اور مغرب سے قریب تر ہونے کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوئی، جدید نظریات کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے لیے سرکاری علماء کا ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ ضیا کوک الپ جیسا شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اتحاد اسلامی کے مقابلہ میں اتحاد تورانی کی زبردست تبلیغ کی، ترکوں کو عہد اسلامی کی تاریخ اور اس کے نامور بہادروں سے نفرت دلا کر قدیم وحشی تاتاریوں پر فخر کرنا سکھایا (جن میں چنگیز اور ہلاکو کی شخصیتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں) ترکی زبان کو اسلامی ادب کی خصوصیات سے پاک کرنے کی کوشش کی، اور تمدن، معاشرت، تہذیب و اطوار اور عملی زندگی کے تمام طریقوں میں مغرب کی پوری تقلید کرنے پر زور دیا۔ اس قسم کے خیالات رکھنے والا شخص، جدید انقلابی جماعت کا امام مجتہدین کر اٹھا اور اس نے کوشش شروع کی کہ اپنے متبعین کے ساتھ مل کر اسلامی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرے جس سے چند گنے چنے عقائد اور اخلاقی اصولوں کے سوا اسلام کی ہر چیز کو قابل تغیر ثابت کر کے مغربی سانچے میں ڈھال دیا جا سکے۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا

ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ وکلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوتے ہیں خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنتِ رسول میں مقرر کئے گئے ہیں۔

غرض ایک طرف علما۔ اور مشائخ اپنی اس روش پر قائم رہے جو ترکی قوم کو سو برس کے اندر تنظیمات کے مقام سے ہٹا کر انقلابیت کے اس مقام تک کھینچ کر لائی تھی۔ اور دوسری طرف ترکی قوم کے انقلابی لیڈروں سے مسلمان ہونے کے باوجود دماغ اور فکر و عمل کی واقعی دنیا میں اسلام سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں جنگِ عظیم پیش آئی جس میں عرب اور ہندوستان کے بدقسمت مسلمانوں نے اعدائے اسلام کے ساتھ مل کر ترکوں کے گلے کاٹے۔ پھر جنگِ عظیم کے بعد جب ترکوں نے اپنی حیاتِ قومی کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس میں سب سے زیادہ ان کی مخالفت جنہوں نے کی وہ خلیفۂ وقت اور شیخ الاسلام تھے۔ یہ آخری ضربات انقلابی ترک کی نیم جان اسلامیت کے لیے فیصلہ کن تھیں۔ انہی کا نتیجہ ہے جو آج ہم کو ترکی جدید کی غیر معتدل تجدد پسندی کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔

۱۹۰۸ء میں جو انقلابی خیالات ابھی خام تھے اور جن کو جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم اور حملۂ یونان کی مشغولیتوں نے پختہ ہونے سے روک رکھا تھا وہ لوزان کانفرنس کے بعد پختگی کو پہنچ گئے اور عملی شکل اختیار کرنے لگے۔ تمدن و معاشرت میں کامل مغربیت۔ زبان اور ادب اور سیاست میں انتہا درجہ کی نسلی عصبیت، الغائے خلافت کے بعد مذہب و سلطنت کی تفریق اور پھر خالدہ خانم کے بقول سلطنت کو مذہب سے آزاد کر کے مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دیا۔ اسلامی قانون کے بجائے سوئٹزرلینڈ کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور نکاح و طلاق وغیرہ مسائل میں قرآن کے صریح احکام تک کو بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف اس آزادی کی روش پر ڈال دینا جس پر جنگ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں، یہ سب قدرتی نتائج ہیں جاہل علما کے جمود، اور ہوا پرست صوفیا کی گمراہی، اور خلافت کے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خود غرضی، اور انقلابی لیڈروں کی قرآن اور سنت رسولؐ کے علم سے کلی جہالت کے۔ افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصولِ اسلام کو ان حالات پر منطبق کر کے ایک ایسا سوچا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب و سنت پر ہوتی اور جس میں رفتارِ زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے

تکار رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار ترکی کے علماء و مشائخ ہیں۔ انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کے لیے تن تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف دھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب دھکیل کر رہیں گے۔ دوسری طرف جدت پسند حضرات ہر اس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی، اب ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ میں اور نورِ علم ہے تو آسمانِ انقرہ سے اتری ہوئی وحی میں۔ حالانکہ بے چارے اتاترک اور اس کے متبعین کا حال یہ ہے کہ

وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۔ (الزخرف۔۲۰)

ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ۔ فروری ۱۹۳۷ء

عقلیت کا فریب (۱)

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم اور تہذیب کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ اِن تحریروں اور تقریروں سے ہو سکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ صاحب کا ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے اپنی سیاحتِ چین و جاپان کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہمارے ساتھ جو چینی مسافر ہیں وہ انتہا کے بلانوش اور شراب خور ہیں۔ سور کا گوشت تو ان کی جان ہے۔ اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا۔ چینی اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ عار پاتا ہے۔ اس کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا مگر اسلام اس کو اس کی تمام مرغوب غذاؤں سے محروم کر دیتا ہے۔ بچارہ ناچار عیسائی ہو جاتا ہے .... کچھ عجب نہیں کہ آئندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہلِ یورپ اور اہلِ چین کے نومسلموں کے ساتھ ذرا ڈھیل دینا پسند کرتا ہوں۔ قرآن سے بھی مجھے اس کے قطعی حرام ہونے میں شک ہے۔ زیادہ یہ یہی نہیں کہ اہلِ عرب کے

لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسے ممالک میں جہاں اس کے
بغیر فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو جاتے تو کیا ہرج ہے؟
بہر حال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ
میں اب تک نہیں آئی ورنہ اصولاً معدہ اور محرکات اخلاق میں اس قدر بُعد
ہے کہ مذہب ہمارے کھانے کا مینو (Menu) بھی تیار کرے تو پھر
کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری اور زرگری و خیاطی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ
سکھاتے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اسلام کے ترقی ذکر نے کا راز اسی میں
پنہاں ہے کہ وہ آدمی کے تمام حقوق انسانی سلب کر کے اس کو ایک لاشہ
بے جان اور ایسا بے حس بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں
سب بھول جاتا ہے۔ ورنہ مذہب درحقیقت اسی قدر ہونا چاہیے جیسا
کہ عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے۔

اس کے بعد وہ سنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

خدا کی اس بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر دل گواہی نہیں دیتا
کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائیں گے گویا
ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہے۔ پھر وہ سب کے
سب الاماشاء اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو
انہوں نے دوزخ میں رکھے جانے کے لیے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انہوں
نے خدا کی زمین کو معمور کر دیا ہے؟ نہ وہ حاجیوں کو قتل و غارت کرتے ہیں؛
نہ ان میں قوم لوط کا عمل ہے نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کر لیتے ہیں اور نہ اس کو

جائز کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں۔ خاموشی سے اس زندگی کو بھسن مشغول طے کر رہے ہیں۔ پھر بھی وہ مستحق دوزخ ہیں۔ آخر کیوں؟ ....
یقیناً مشرکانہ عقیدہ ایک سودا سے خام ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا فطرۃً قائل ہو جاتا ہے جو اس کو مارتی اور جلاتی ہے تو محض اس لئے کہ اس کی ماہیت اس کی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے ، یادہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا ، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھاتے۔ منہ پر چار انگل کی داڑھی ہو۔ کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم دھرکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا۔"

جاپان کی بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں۔
"دو گھنٹے تک میں کوبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور نہ کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو۔"

پھر وہ بقول خود "موعظہ حسنہ" شروع کرتے ہیں۔
"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں اس کا فطری مقصود یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اور ہوں گے۔ یہی دراصل مذہب اسلام ہے۔

اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام دے رکھا ہے وہ محض تمہارے
نفس کا دھوکا ہے یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دونوں باتوں
پر مذہب کو محدود کر دو گے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالو گے
تم بھی قوموں کے ساتھ بام ترقی پر پہنچو گے بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں خیر پیدا
کر دو گے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی
نہ جا سکے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدارا اس
حصے کہنے کا موقع تو نہ دو کہ فلاں قوم بر سر اوج ہے مگر جو ان میں مسلمان ہیں
ان کی حالت زبوں ہے، اور یقیناً اس زبونی کا ذمہ دار ان کا عجیب و غریب
مذہب ہے۔"

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان
کے گھر پیدا ہوئے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھے، مسلمانوں کے ساتھ
معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ
ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں
اس طرح بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے اور اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر
قبل اس کے کہ اس اضطراری و غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اختیاری
اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو
پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی
دیکھ لیتے، انہیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قوائے
ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں

پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلا سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت (Rationalism) کا سبق سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بالکل یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت دراصل فرنگی عقلیت ہو گئی نہ کہ آزاد عقلیت۔ انھوں نے مغرب سے تنقید (Criticim) کا درس بھی لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا بلکہ اس چیز کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے فارغ ہو کر نکلے اور زندگی کے میدان عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے، شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے، مگر سوچنے اور سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل۔ اب انھوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی اور ہر اس چیز کو غلط اور قابل ترمیم سمجھ لیا جسے اس معیار کے خلاف پایا، خواہ وہ اسلام کے اصول و فروع میں سے ہو، یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔

ان میں سے بعض نے تحقیق حال کے لیے کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا۔ مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے سوراخ میں اسلام کی سیدھی میخ آخر بیٹھتی تو کیونکر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے تقریر فرما رہے ہیں۔ نہ ان کے مقدمات درست ہوتے ہیں، نہ منطقی اسلوب پر ان کو ترتیب دیتے ہیں اور نہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں۔ ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعتہً ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور اپنی پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے۔ سستی فکر (Loose-Thinking) ان کے مذہبی ارشادات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے سوا دوسرے جس مسئلے پر بھی بولیں گے ہوشیار اور چوکنے ہو کر بولیں گے، کیونکہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہو گئی تو جانتے ہیں کہ اہل علم کی نگاہ میں کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ لیکن مذہب چونکہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنے دماغ پر زور دینا ضروری سمجھیں، اس لیے وہ یہاں بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں، گویا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہیں، اور محض تفریح کے طور پر بول رہے ہیں جس میں ضابطۂ کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی سطحیت

اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدر کم غور و فکر کے ساتھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جاتے تو آبرو جاتی رہے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو گیا اس پر رائے قائم کر لی اور بے تکلف اس کو بیان کر دیا۔ اس لیے کہ کسی گرفت کا یہاں خوف ہی نہیں گرفت اگر کرے گا تو مولوی کرے گا اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصول موضوعہ کے طور پر داخل مسلمات ہو چکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دقیانوسی اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل مضمون نگار کی زیرِ نظر تحریر، چشم بددور، ان دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے مضمون سے یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے۔ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ مسلم ہو گا یا غیر مسلم۔ جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کرے گا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ (Orthodox) ہو یا آزاد خیال، یا اصلاح طلب، بہر حال اس کے لیے لازم ہو گا کہ دائرہ اسلام کے اندر رہ کر کلام کرے یعنی قرآن کو منتہائے کلام (Final Authority) سمجھے اور ان اصول دین و قوانین شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند کو نہ مانے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو، تو دائرہ اسلام سے باہر نکل آئے گا، اور اس دائرے سے نکلنے کے بعد اس کی مسلمانہ حیثیت باقی ہی نہ رہے گی کہ وہ اس میں کلام کر سکے۔ رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو تو اس حیثیت میں اسے پورا حق ہو گا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر

جیسی چاہے تنقید کرے، اس لیے کہ وہ اس کتاب کو منتہائے کلام نہیں مانتا لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام کے معنی سمجھانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بتانے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ ایک صاحب عقل و شعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کرے گا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کون سی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا۔ کیونکہ بیک وقت اپنے آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کیے ہوئے اصول و قوانین پر نکتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا، قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو موعظہ حسنہ بھی سنانا کسی عاقل کا فعل نہیں ہو سکتا۔ یہ نقیضین کو جمع کرنا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی، دائرہ اسلام کے اندر بھی ہو اور باہر بھی۔

مضمون نگار صاحب کی علمی قابلیت اور ان کی معقولیت کی طرف سے ہم اتنے بدگمان نہیں ہیں کہ ان سے یہ امید رکھیں کہ اگر وہ اسلام کے سوا کسی مسئلہ پر کلام فرماتے تو اس میں بھی اس طرح دو مختلف حیثیتوں کو بیک وقت اپنے اندر جمع کر لیتے۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصر ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصر ہند کے منظور کیے ہوئے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے۔ نہ ہم ان سے اس جرأت کی امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی مسلک فکر (School of thought) کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے لیکن طرفہ ماجرا ہے کہ اسلام کے معاملہ میں انہوں نے دو بالکل مختلف حیثیتیں اختیار کی ہیں،

اور یہ محسوس تک نہیں کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہے ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں کا سا نام رکھتے ہیں، مسلمانوں کی زبوں حالی پر رنج فرماتے ہیں، اسلام کی ترقی کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، مسلمانوں کو "احسان" یعنی "اصل دین" کا وعظ سناتے ہیں۔ دوسری طرف اس کتاب کے مقرر کیے ہوتے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس کو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔ قرآن ایک نہیں چار جگہ بالتصریح سؤر[1] کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا پسند فرماتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ڈھیل دینے کی یہ خواہش بھی "ترقی اسلام" کے لیے ہے۔ گویا ترقی اسلام کی فکر آپ کو قرآن سے بھی زیادہ ہے! یا کوئی اسلام قرآن سے باہر بھی ہے جس کی ترقی آپ چاہتے ہیں! قرآن فی الواقع انسان کے لیے کھانے کا مینو (Menu) تیار کرتا ہے، کھانے کی چیزوں میں حرام و حلال خبیث و طیب کا فرق قائم کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ تم اپنے اختیار سے کسی شے[2] کو حلال اور حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے مگر آپ کو اپنے حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل دے۔ قرآن مذہب کو ان حدود میں نہیں رکھتا جن میں سینٹ پال (نہ کہ مسیح) کے متبعین نے اس کو محدود کیا ہے۔ وہ لباس، اکل و شرب، نکاح و طلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت

---

[1] ملاحظہ ہو۔ البقرہ رکوع ۲۱۔ المائدہ، ۱۔ الانعام ۱۸، النحل ۱۵۔

[2] "اور جو کچھ تمہارے منہ میں آتے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال اور وہ حرام ہے"۔ (سورہ نحل رکوع ۱۵)

تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرتا ہے۔ مگر آپ اس قسم کی قانون سازی کو غلط سمجھتے ہیں، اس کو ترقی اسلام میں مانع قرار دیتے ہیں، اس پر الزام رکھتے ہیں کہ وہ انسان کو ایک لاشہ بے جان اور بے بس بچہ بنا دیتا ہے، اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب اسی قدر ہونا چاہیئے جس قدر عیسائیوں (دراصل پولسیوں) نے سمجھا ہے۔ قرآن نے خود قوانین شریعت بناتے ہیں اور ان کو حدود اللہ سے تعبیر کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ مگر آپ شریعت کی ان حدود کو بیڑیوں سے تعبیر کرتے ہیں، اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان بیڑیوں کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک ایمان نجات کی پہلی اور لازمی شرط ہے اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے متعلق وہ بالفاظ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے[1]۔ خواہ وہ بے شمار ہوں یا شمار میں آجائیں، خوشحال ہوں یا بدحال، مگر آپ کا یہ حال ہے کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر آپ کا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد وہ سب دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے، اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دینے کے سوا اور کونسا قصور کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں، اور مسلمان ہوتے ہوتے قرآن سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمایئے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرہ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجیے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام و قوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل

---

[1] اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ (سورہ انبیاء ع ۹)

ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو ان کی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو، اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابل اعتراض ہوں، اس کے لیے دو راستے کھلے ہوتے ہیں، یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے، پھر اس کو حق ہوگا کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی کرے، یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مظاہرہ کرنے سے احتراز کرے اور مجتہدین کر اس کے قواعد و ضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر اپنے شکوک و شبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔ عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے ہو سکتے ہیں، اور مرد عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہوگا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن فاضل مضمون نگار اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم و تربیت پاتے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے، اس لیے انہوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، ترقی اسلام کے آرزومند بھی بنتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں، اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے، حدیث و فقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے، اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم ارباب عقل (Rationalists) ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملاؤں پر ان کا سب سے

بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ مگر خود ان کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح متناقض باتیں کرتے ہیں، متضاد طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کرجاتے ہیں۔ آخر یہ رشنلزم کی کونسی قسم ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے۔

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے۔

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود اٹھا دی جائیں اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے، کیونکہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حرام و حلال کے قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں، اس میں آدمی کے انسانی حقوق سلب کرکے اس کو ایک لاشہ بے جان اور بے بس بچہ نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو آزادی دے دی گئی ہے کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے۔ مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے۔ اور قرآن نے ایمان و عمل صالح کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہے، عمل صالح کے لیے حدود و قیود مقرر کئے ہیں، قوانین بنائے ہیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظامِ عمل مقرر کیا ہے جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام اور اس کی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہے کیونکہ اس کا نسخ قرآن کا نسخ ہے، اور قرآن کا نسخ اسلام کا نسخ ہے، اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہو جائے تو اس کی ترقی کے کیا معنی؟ آپ خود کسی مذہب کو ایجاد کرکے اس کی اشاعت فرما سکتے ہیں۔ مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اس کو اسلام کے نام سے موسوم کرنے اور اس کی ترقی

کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہوں گے۔ یہ بات غالباً آپ نے اس اُمید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہو جاتے گا تو بالکل نرم اور آسان ہو جائے گا اور خوب پھیلتا چلا جاتے گا۔ لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنی پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کے لیے سب سے پہلے تو حیاتِ اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جواب دہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے۔ ایک یہ کہ جس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے اس کو متعین کر لیا جاتے، اور اس کی بالا دستی تسلیم کر لی جاتے۔ دوسرے یہ کہ جواب دہی کی نوعیت متعین کی جاتے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جاتے کہ کن اعمال سے اس جواب دہی میں کامیابی نصیب ہو گی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ جواب دہی میں کامیابی اور ناکامی کے جدا جدا نتائج متعین کیے جائیں کیونکہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے، یا سرے سے دونوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جواب دہی بالکل بے معنی ہے۔ یہ اس عقیدہ کے عقلی لوازم ہیں جس کو آپ اصل دین قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام قائم کر دیا جاتے تب بھی وہی مصیبت پیش آتے گی جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ پھر وہی خدا کو ماننا لازم آتے گا جس کے بغیر جاپان آپ کو ترقی کے بام پر چڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پھر وہی شریعت کی بیڑیاں اور اخلاق کی زنجیریں تیار ہو جائیں گی جن کو آپ توڑنا چاہتے ہیں اور جن

کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہے، پھر یہی
عذاب وثواب کا جھگڑا نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر
خوش وخرم وخوشحال دیکھ کر آپ کا دل پھر اس بات پر گواہی دینے سے انکار کردے
گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہ کرم اب ذرا غور کر کے کسی ایسی چیز کا نام اسلام رکھیے جس میں کسی قسم کی قید وبند
نہ ہو، جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو، جس میں صرف خدا کی زمین کو معمور
کر دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے کافی ہو، اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار
خلقت کو خوش وخرم وخوشحال دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے کہ وہ سب جنت
کی بلبلیں بنائی جائیں گی۔

قرآن کی رو سے سور کے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلّم نہیں ہے۔
آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کردیا گیا ہوگا
لیکن اگر آپ اس رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک
کی تحقیق ہوجاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ
يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ الانعام۔ رکوع ۱۸۔

اے پیغمبر کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں تو کسی چیز کو جسے کوئی کھانے والا
کھاتے ہیں حرام نہیں پاتا الا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سور کا گوشت ہو کیونکہ

وہ رجس یعنی ناپاک ہے۔ یا نافرمانی کے طور پر اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو
پھر جو شخص مجبور ہو گیا بغیر اس کے کہ وہ نافرمان اور حد ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو
تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں سؤر کے گوشت کو "طاعم" یعنی کھانے والے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور حرمت کی علت یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ "رجس" (ناپاک) ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا ایک ہی چیز عرب کے لیے رجس اور غیر عرب کے لیے طیب و طاہر ہو سکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مردار کھانے والوں کے لیے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟ آپ سؤر کے معاملہ میں ڈھیل چاہتے ہیں تو خود اپنی طرف سے دیجئے، مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اس کی قطعی ممانعت مشکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ خاص اہل عرب کے لیے تھا، خواہ قرآن میں اس تخصیص کی طرف کوئی ذرا سا اشارہ بھی نہ ہو اور تخصیص کے لیے وہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعید نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

اور فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے استدلال تو اتنا لطیف ہے کہ صاحب سفر نامہ کے علم و فضل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً اس آیت کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہو گا کہ جب سؤر کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھا لو

مگر باغ میں بیٹھ کر نہ کھانا اور نہ اس کی عادت ڈالنا"

سؤر کے گوشت کے معاملہ میں اہلِ یورپ اور اہلِ چین سکے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو نہ اضطرار کے معنی جانتا ہو، نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو، اور نہ عادی کا۔ ورنہ جاننے والے کے لیے تو اتنی جرأت کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ جن لوگوں کو مردار خوری یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں، یا جن کے ہاں مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیۡرِ اللّٰهِ[1] کے کھانے کا عام دستور ہو، وہ سب مجبوروں میں داخل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنی ہو جاتا۔ کیونکہ اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو ان چیزوں کے خوگر تھے، تو استثناء سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انہیں کھاتے رہتے، اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے تو ان کے لیے اس حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اضطرار (مجبوری) کے ساتھ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لگا کر جو استثناء کیا گیا ہے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو، اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو نہ ملتی ہو، وہ محض جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے بشرطیکہ حدِ رخصت سے تجاوز نہ کرے، یعنی جان بچانے کے لیے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے اور حدود اللہ کے توڑنے کی خواہش اس کے دل میں نہ ہو۔ اسی بات کو ایک دوسری جگہ سؤر اور مردار وغیرہ چیزوں کی تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ مَخۡمَصَةٍ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ[2] یعنی جو شخص

---

[1] خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا ہوا۔ [2] المائدہ: ۳

بھوک کی شدت سے مجبور ہو جاتے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف کوئی میلان اس کے دل میں ہو وہ ایسی حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے۔ کہاں یہ بات اور کہاں وہ کہ اہلِ یورپ اور اہلِ چین چونکہ سؤر کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہٰذا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے سؤر کو جائز کر دیا جاتے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔ اگر کسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں ڈھیل دینے کا سلسلہ شروع ہو جاتے تو شراب، جوا زنا، سود اور ایسی ہی دوسری تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام ماننے اور اس کے قائم کیے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کے لیے کم و بیش پر سودا کرے؟

پہلے تو صرف سور ہی کے حرام ہونے کی علت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولاً معدہ اور محرکاتِ اخلاق میں بُعدِ بعید ہے، لہٰذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کا امتیاز قائم کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ اس ارشاد سے یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ جتنا قرآن کے متعلق جانتے ہیں، حکمتِ طبیعی (Physical Science) کے متعلق بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن سے ناواقف ہونا تو خیر ایک "روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی" کے لیے شرمناک نہیں ہے مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرمناک ہے۔ آپ کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ انسان

کے نفس اور اس کی ترکیب جسمانی کے درمیان کیا تعلق ہے، اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ جو چیز جسم کو اس کے ضائع شدہ اجزا سے ترکیبی فراہم کرتی ہے، جس سے بدن کے تمام ریشے اور اعصاب از سر نو بنتے ہیں، جو چند سال کے اندر پرانے جسم کی جگہ نیا جسم پورا کا پورا بنا دیتی ہے، اس کی خصوصیات کا اثر نفس اور روح پر ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا قابل تعجب ہے۔ اس حقیقت سے سائنٹفک دنیا پہلے عموماً غافل تھی۔ مگر فن تغذیہ (Dietetics) پر حال میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے یہ راز منکشف ہو گیا ہے کہ انسان کے اخلاق اور اس کی ذہنی قوتوں پر اس کی غذا کا اثر ضرور مترتب ہوتا ہے۔ چنانچہ آجکل کے حکما اس تجسس میں لگے ہوتے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں سے ہمارے نفس اور قوائے فکری پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گئو بجویٹ دوست کی سائنٹفک معلومات تازہ (Up-to-date) نہیں ہیں، ورنہ وہ اتنی جرأت کے ساتھ یہ دعوی نہ کر دیتے کہ اصولاً معدہ اور محرکات اخلاق میں بُعد ہے۔

(ترجمان القرآن۔ شعبان ۱۳۴۵ھ۔ دسمبر ۱۹۲۶ء)

عقلیت کا فریب (۲)

عقلیت (Rationalism) اور فطریت (Naturalism)

یہ دو چیزیں ہیں جن کا اشتہار گزشتہ دو صدیوں سے مغربی تہذیب بڑے زور شور سے دے رہی ہے۔ اشتہار کی طاقت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ جس چیز کو پیہم اور مسلسل اور بکثرت نگاہوں کے سامنے لایا جاتے اور کانوں پر مسلط کیا جائے اس کے اثر سے انسان اپنے دل اور دماغ کو کہاں تک بچاتا رہے گا۔ بالآخر اشتہار کے زور سے دنیا نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ مغربی علوم اور مغربی تمدن کی بنیاد سراسر عقلیت اور فطریت پر ہے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد نہ عقلیت پر ہے نہ اصولِ فطرت کی متابعت پر، بلکہ اس کے برعکس اس کا پورا ڈھیر حس اور خواہش اور ضرورت پر قائم ہے۔ اور مغربی نشاۃِ جدیدہ دراصل عقل اور فطرت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس نے معقولات کو چھوڑ کر محسوسات اور مادیت کی طرف رجوع کیا۔ عقل کے بجائے حس پر اعتماد کیا۔ عقلی ہدایات اور منطقی استدلال اور فطری وجدان کو رد کر کے محسوس مادی نتائج کو اصلی و حقیقی معیار قرار دیا۔ فطرت کی رہنمائی کو مردود ٹھہرا کر خواہش اور ضرورت کو اپنا رہنما بنایا۔ ہر اس چیز کو بے اصل سمجھا جو ناپ اور تول میں نہ آسکتی ہو۔ ہر اس چیز کو ہیچ اور ناقابلِ اعتنا قرار دیا جس پر کوئی محسوس مادی منفعت مترتب نہ ہوتی ہو۔ ابتدا میں یہ حقیقت

خود اہل مغرب سے چھپی ہوتی تھی، اس لیے وہ عقل اور فطرت کے خلاف چلنے کے باوجود یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے جس روشن خیالی کے دورِ جدید کا افتتاح کیا ہے اس کی بنیاد "عقلیت" اور فطرت پر ہے۔ بعد میں اصل حقیقت کھلی مگر اعتراف کی جرأت نہ ہوتی۔ مادہ پرستی، اور خواہشات کی غلامی، اور مطالبات نفس و جسد کی بندگی پر منافقت کے ساتھ عقلی استدلال اور ادعائے فطریت کے پردے ڈالے جاتے رہے۔ لیکن اب انگریزی محاورے کے مطابق "بلی تھیلے سے بالکل باہر آچکی ہے"۔ غیر معقولیت اور خلاف ورزی فطرت کی بے اعتنی بڑھ چکی ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس لیے اب کھلم کھلا عقل اور فطرت دونوں سے بغاوت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ علم اور حکمت کی مقدس فضا سے لے کر معاشرت، معیشت اور سیاست تک ہر جگہ بغاوت کا علم بلند ہو چکا ہے اور "قدامت پرست" "منافقین کی ایک جماعت" کو مستثنیٰ کر کے دنیائے جدید کے تمام رہنما اپنی تہذیب پر صرف خواہش اور ضرورت کی حکمرانی تسلیم کر رہے ہیں۔

مشرقی مستغربین و متفرنجین اپنے پیشواؤں سے ابھی چند قدم پیچھے ہیں۔ ان کا دماغی نشوونما جس تعلیم اور جس ذہنی فضا اور جن عوامل تہذیب و تمدن کے زیرِ اثر ہوا ہے ان کا اقتضا یہی ہے کہ وہی محسوسات و مادیات کی پرستش اور خواہشات و ضروریات کی غلامی ان میں بھی پیدا ہو اور فی الواقع ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مگر ابھی تک یہ اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں بلی تھیلے سے باہر آ جاتی ہے۔ اپنی تحریر و تقریر میں یہ اب بھی کہے جا رہے ہیں کہ ہم صرف عقل اور فطرت کی رہنمائی تسلیم کرتے ہیں، ہمارے سامنے صرف عقلی استدلال پیش کرو، ہم کسی ایسی چیز کو نہ مانیں گے جو عقلی دلائل اور فطری شواہد سے ثابت نہ کر دی جائے۔ لیکن ان تمام بلند آہنگیوں کے تھیلے میں وہی

بل چسپی ہوتی ہے جو نہ عقلی ہے اور نہ فطری - ان کے مقالات کا تجزیہ کیجیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ معقولات اور فطری وجدانیات کے ادراک سے ان کے ذہن عاجز ہیں - جس کو "عقلی فائدہ" کہتے ہیں، اس کی حقیقت پوچھئے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد "تجربی فائدہ" ہے، اور تجربی فائدہ وہ ہے جو ٹھوس ہو، وزنی ہو، شمار اور پیمائش میں آ سکے - کوئی چیز جس کا فائدہ ان کو حسابی اعداد سے گن کر، یا ترازو کے پلڑوں سے تول کر، یا گز سے ناپ کر نہ بتایا جا سکے، اس کو یہ مفید نہیں مان سکتے، اور جب تک اس معنی خاص میں اس کی افادیت ثابت نہ کر دی جائے اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ان کے نزدیک ایسا فعل ہے جس کو "غیر معقولیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ فطرت کی رہنمائی جس کی پیروی کا ان کو دعویٰ ہے اس کی حقیقت بھی تھوڑی سی جرح میں کھل جاتی ہے۔ فطرت سے مراد ان کے نزدیک انسانی فطرت نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہے۔ جو وجدان اور شہادتِ قلبیہ سے خالی ہے اور صرف حس، خواہش اور مطالبات نفس و جسد ہی رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اعتبار کے قابل صرف وہی چیزیں ہیں جو حواس کو متاثر کر سکیں، خواہشات کو تسکین دے سکیں، جسمانی یا نفسانی مطالبات کو پورا کر سکیں، جن کا فائدہ فوراً مشاہدہ میں آجائے اور جن کا نقصان نظروں سے اوجھل ہو یا فائدہ کے مقابلہ میں ان کو کم نظر آجائے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرت انسانی کے مقتضیات سے ہیں، جن کی اہمیت کو انسان اپنے وجدان میں پاتا ہے، جن کے فوائد یا نقصانات مادی اور حسی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں وہ اوہام اور خرافات ہیں، ہیچ اور ناقابل اعتنا ہیں، ان کو کسی قسم کی اہمیت دینا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی تاریک خیالی، وہم پرستی اور دقیانوسیت ہے، ایک طرف عقل و فطرت سے یہ انحراف ہے، دوسری طرف

عقلیت و فطریت کا دعویٰ ہے، اور عقل کے دیوالیہ پن کا حال یہ ہے کہ وہ اِس اجتماعِ ضدین کو محسوس تک نہیں کرتی۔

تعلیم اور تہذیبِ فکر کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیئے کہ اس کے خیالات میں الجھاؤ باقی نہ رہے، افکار میں پراگندگی اور ژولیدگی نہ ہو۔ وہ صاف اور سیدھا طریقِ فکر اختیار کر سکے، مقدمات کو صحیح ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکے، تناقض اور خلطِ مبحث جیسی صریح غلطیوں سے بچ سکے۔ لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہم اپنے عام تعلیم یافتہ حضرات کو دماغی تربیت کے ان ابتدائی ثمرات سے بھی محروم پاتے ہیں۔ ان میں اتنی تمیز بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے اپنی صحیح حیثیت متعین کر لیں، پھر اس حیثیت کے عقلی لوازم کو سمجھیں، اور ان کو ملحوظ رکھ کر ایسا طریقِ استدلال اختیار کریں جو اس حیثیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان سے گفتگو کیجیے یا ان کی تحریریں دیکھیے۔ پہلی نظر ہی میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان کے خیالات میں سخت الجھاؤ ہے۔ بحث کی ابتدا ایک حیثیت سے کی تھی، چند قدم چل کر حیثیت بدل دی، آگے بڑھے تو ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی۔ اثباتِ مدعا کے لیے مقدمات کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کرنا اور ان کو منطقی اسلوب پر مرتب کرنا تک نہ آیا۔ آغاز سے لے کر اختتام تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دراصل آپ کا مدعا کیا ہے، کس مسئلے کی تحقیق پیشِ نظر تھی اور کیا آپ نے ثابت کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کے اثر سے موجودہ تعلیم کا میلان زیادہ تر حسیات اور مادیات کی طرف ہے۔ وہ خواہشات کو تو بیدار کر دیتی ہے، مطلوبات اور ضروریات کے احساس کو بھی ابھار دیتی ہے، محسوسات کی اہمیت بھی دلوں میں بٹھا دیتی ہے،

مگر عقل اور ذہن کی تربیت نہیں کرتی، تنقید اور تفکر کا پندار تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور یہی پندار ان کو ہر چیز پر "عقلی" تنقید کرنے اور ہر اس چیز سے انکار کر دینے پر آمادہ کرتا ہے جو ان کی عقل میں نہ سماتے، مگر در حقیقت ان کا ذہن عقلیت سے منحرف ہوتا ہے اور صحیح عقلی طریق پر کسی مسئلے کو سلجھانے یا کسی امر میں رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

اس غیر معقول "عقلیت" کا اظہار سب سے زیادہ ان مسائل میں ہوتا ہے جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جن کے روحانی و اخلاقی اور اجتماعی و عمرانی مبادی مغرب کے نظریات سے ہر ہر نقطہ پر متصادم ہوتے ہیں۔

آپ کسی انگریزی تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجئے اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لیے اس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجئے، پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجئے۔ وہ فوراً اپنے شانے ہلائے گا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ یہ ملائیت ہے، میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ، اگر تمہارے پاس معقولات نہیں صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔ بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے، اس غریب کو برسوں کی تعلیم و تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ مسلمان ہوگا۔ یا کافر ہوگا۔ اگر مسلمان ہے تو مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہے اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے

اس کا رسول جو کچھ حکم پہنچائے گا اس کی اطاعت وہ بے چون و چرا کرے گا۔ اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجت عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں رہا۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ کوئی خاص حکم رسولِ خدا نے دیا ہے یا نہیں۔ جب حجت نقلی سے یہ حکم ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہیئے۔ وہ اپنے اطمینانِ قلب اور حصولِ بصیرت کے لیے حجت عقلی دریافت کر سکتا ہے۔ مگر اس وقت جب کہ وہ اطاعتِ حکم کے لیے سر جھکا چکا ہو، اطاعت کے لیے حجتِ عقلی کو شرط قرار دینا، اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل رسولِ خدا کی حاکمیت (اتھارٹی) کا انکار کر رہا ہے اور یہ انکار مستلزم کفر ہے، حالانکہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے صحیح جائے قیام دائرۂ اسلام کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ سب سے پہلے اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اس سے نکل جائے۔ اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائے گا کہ حجتِ عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے۔

یہ قاعدہ عقلِ سلیم کے مقتضیات میں سے ہے اور دنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ کوئی حکومت ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے حکم پر حجتِ عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعتِ امر سے انکار کر دے۔ کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں بن سکتی اگر اس کا ہر سپاہی جنرل کے حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب

کو اطاعت کے لیے شرط قرار دے۔ کوئی مدرسہ، کوئی کالج، کوئی انجمن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں ہو سکتا کہ ہر ہر فرد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے، اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے، انسان جس نظام میں داخل ہوتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کے اقتدارِ اعلیٰ پر کلی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا جزء ہے اس کا فرض ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت کرے، خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔ مجرمانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امر دیگر ہے۔ ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کر کے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے جزیہ میں بھی اپنے ذاتی اطمینان کو اطاعت کے لیے شرط قرار دیتا ہے تو دراصل وہ اقتدارِ اعلیٰ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور یہ صریح بغاوت ہے۔ حکومت میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تو اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا جائے گا، فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہوگا، مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائے گی، مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لیے کہ اس نوع کے طلب حجت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے طالب حجت کا صحیح مقام اندر نہیں، باہر ہے۔ پہلے وہ باہر نکل جائے پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

اسلام کی تعلیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جتنی حجتیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت سے

انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا تے واحد ہی اس کا الٰہ ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنیادی مسئلہ پر کر لیجیے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو آپ کو داخلِ اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ احکام اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک "مسلم" کی ہوگئی اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے کا انحصار آپ کے اطمینانِ قلب پر ہو۔ مسلم بن جانے کے بعد آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون و چرا اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور-۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان، اور ایسی طلب حجت جو تسلیم و اطاعت کے لیے شرط ہو، باہم متناقض ہیں، اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل سلیم کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجت نہیں ہوسکتا، اور جو ایسا طالب حجت ہے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب-۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

اسلام نے اصلاح اور تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھا دینے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رک گئے۔ اور جس چیز کا حکم دیا گیا وہ ایک اشارے پر لاکھوں کروڑوں انسانوں میں رائج ہو گئی۔ اگر ایک ایک چیز کے لیے عقلی حجتیں پیش کرنا ضروری ہوتا اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر اطاعتِ احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی اخلاق کی وہ اصلاح اور اعمال کی تنظیم نہ ہو سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے احکام خلافِ عقل ہیں یا اس کا کوئی جزئی حکم بھی حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ اسلام اپنے پیروؤں سے اندھوں کی سی تقلید چاہتا ہے اور احکام کی عقلی و فطری بنیادوں کو تلاش کرنے اور ان کے مصالح و حکم کو سمجھنے سے روکتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی کے لیے تفقہ اور تدبر ضروری ہے۔ جو شخص احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو جتنا زیادہ سمجھے گا وہ اتنا ہی زیادہ صحیح اتباع کر سکے گا۔ ایسے فہم اور ایسی بصیرت سے اسلام روکتا نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے اس عقلی تجسس میں جو اطاعت کے بعد ہو، اور اس عقلی امتحان میں جو اطاعت سے پہلے اور اطاعت کے لیے شرط ہو۔ مسلم سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کرتا ہے، پھر احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت

اس کی سمجھ میں آجاتے۔ اس کو تو دراصل خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر اطمینان کلی حاصل ہے۔ اس کے بعد وہ بصیرت تامہ حاصل کرنے کے لیے جزئیات پر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ اطمینان بھی حاصل ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے لیکن اگر حاصل نہ ہو تو اطمینان کلی کی بنا پر جو اسے خدا اور رسول پر ہے، بلا تامل احکام کی اطاعت کیے چلا جاتا ہے اس قسم کی طلب حجت کو اس طلب حجت سے کیا نسبت جو ہر قدم پر پیش کی جائے اور اس داعیہ کے ساتھ پیش کی جائے کہ اگر میرا اطمینان کر دیتے ہو تو قدم اٹھاتا ہوں ورنہ پیچھے پلٹا جاتا ہوں۔

حال میں ایک تحریر ہماری نظر سے گزری جو ایک مسلم جماعت کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ یہ جماعت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، مذہب سے منحرف بھی نہیں۔ بلکہ اپنی دانست میں بڑی مذہبی خدمت انجام دے رہی ہے مذہبی اصلاح کے نام سے جن امور کی تبلیغ وہ کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر سال بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے روکا جاتا ہے اور انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو روپیہ وہ جانوروں کو ذبح کرنے پر صرف کرتے ہیں اسے قومی ادارات کی اعانت یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ اس تبلیغ پر کسی مسلمان نے اعتراض کیا جس کی پوری عبارت ہم تک نہیں پہنچی ہے مگر اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے:۔

"سوائے نقل و تقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی صاحب اس سے پہلے ہم کو اپنے عقیدۂ قربانی کے عقلی پہلو سے آگاہ فرمائیں تو ہمارے

شکریہ کے مستحق ہوں گے۔"

یہ تحریر نمونہ ہے ان لوگوں کی دماغی حالت کا جو اپنے آپ کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ ایک طرف "عقلیت" کا اس قدر زبردست دعویٰ ہے اور دوسری طرف "غیر عقلیت" کا ایسا شدید مظاہرہ ہے۔ صرف یہی دو فقرے جو قلم مبارک سے نکلے ہیں اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنی صحیح حیثیت ہی متعین نہیں کی۔ اگر آپ مسلم کی حیثیت سے بول رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے "نقل" کے آگے سر جھکانا چاہیے۔ پھر عقلی حجت کا مطالبہ کرنے کا حق آپ کو ہوگا، اور وہ بھی شرطِ اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ محض اطمینانِ قلب کے لیے۔ اور اگر آپ اطاعت سے پہلے حجت عقلی کے طالب ہیں اور یہ شرطِ اطاعت ہے تو آپ کو مسلم کی حیثیت سے بولنے کا ہی حق نہیں ہے۔ اس نوع کے طالب حجت کو پہلے ایک غیر مسلم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے پھر اس کو یہ حق تو حاصل ہوگا کہ جس مسئلے پر چاہے اعتراض کرے، مگر یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے کسی امر دینی میں مفتی اسلام بن کر فتویٰ صادر کرے۔ آپ ایک ہی وقت میں ان دونوں متضاد حیثیتوں کو اختیار کرتے ہیں اور ایک حیثیت کے بھی عقلی لوازم پورے نہیں کرتے۔ ایک طرف آپ نہ صرف "مسلم" بلکہ مفتی اسلام بنتے ہیں دوسری طرف آپ کا حال یہ ہے کہ "نقل" کو آپ ہیچ سمجھتے ہیں۔ حکم کا "حکم" ہونا آپ کو نقل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاتا ہے تو آپ اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ پہلے اس حکم کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔ بالفاظ دیگر آپ کسی حکم کو محض حکم خدا و رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں مانیں گے بلکہ اس کے عقلی و تجربی فوائد کی بنا پر مانیں گے۔ اگر ایسے

فوائد معلوم نہ ہو سکیں یا آپ کے معیار پر وہ فوائد ثابت نہ ہوں تو آپ حکم کو رد کر دیں گے، اس کے خلاف پراپیگنڈا کریں گے، اس کو "بے محل"، "بے معنی"، "فضول" بلکہ مضر اور "مسرفانہ رسم" قرار دیں گے اور مسلمانوں کو اس کے اتباع سے روکنے میں اپنی پوری قوت صرف کریں گے۔ کونسی عقل ہے جو اس متناقض طرزِ عمل اور متضاد حیثیات کے اختلاط کو جائز رکھتی ہے؟ حجتِ عقلی کا مطالبہ بجا و درست، مگر پہلے یہ تو ثابت کیجیے کہ آپ ذوی العقول میں سے ہیں۔

"عقلی" اور تجربی فائدہ کسی ایک مخصوص اور معین چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک نسبتی و اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کی عقل ایک چیز کو مفید سمجھتی ہے، دوسرے کی عقل اس کے خلاف حکم لگاتی ہے، تیسرا شخص اس میں کسی نوع کا فائدہ تسلیم کرتا ہے مگر اس کو اہمیت نہیں دیتا اور ایک دوسری چیز کو اس سے زیادہ مفید ٹھہراتا ہے۔ تجربی فوائد میں اس سے بھی زیادہ اختلاف کی گنجائش ہے، فائدے کے متعلق ہر شخص کا نظریہ الگ ہے، اور اسی نظریہ کے لحاظ سے وہ اپنے یا دوسروں کے تجربات کو مرتب کر کے مفید یا غیر مفید ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ ایک شخص نفع عاجل کا طالب ہے، اور صرف ضررِ عاجل کو قابلِ حذر سمجھتا ہے۔ اس کا انتخاب ایسے شخص کے انتخاب سے یقیناً مختلف ہوگا جس کی نظر مآل کار پر ہو۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایک نوع کا فائدہ اور دوسری نوع کی مضرت ہے۔ ایک شخص ان کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ فائدہ کی خاطر مضرت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسرا شخص ان سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اس کی رائے میں ان کی مضرت ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ پھر عقلی اور تجربی فوائد میں بھی بسا اوقات تخالف پایا جاتا ہے۔ ایک چیز

تجربی حیثیت سے مضر ہے مگر عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کسی بڑے عقلی فائدے کے لیے اس مضرت کو برداشت کرنا چاہیئے۔ ایک دوسری چیز ہے جو تجربی حیثیت سے مفید ہے مگر عقل یہ فتوی دیتی ہے کہ کسی عقلی مضرت سے بچنے کے لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایسے اختلافات کی موجودگی میں کسی چیز کے "عقلی" اور "تجربی" فوائد پر کوئی ایسی روشنی ڈالنی ممکن ہی نہیں جس سے تمام لوگ اس کے مفید ہونے پر متفق ہو جائیں، اور انکار کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ محض ایک قربانی پر کیا موقوف ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اوامر و نواہی شریعت میں سے کونسی چیز ایسی ہے جس کے عقلی اور تجربی فوائد پر ایسی روشنی ڈال دی گئی ہو کہ وہ کالشمس فی النہار نظر آنے لگے ہوں اور تمام لوگوں نے ان کو تسلیم کر کے ان کی پابندی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ایک شخص بھی دنیا میں تارکِ صوم و صلوٰۃ اور منکرِ حج و زکوٰۃ نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے احکام کو ہر شخص کی عقل اور تجربہ کے فتوے پر موقوف نہیں رکھا بلکہ ایمان اور اطاعت کو اساس بنایا ہے۔ مسلم، عقلی اور تجربی فوائد پر ایمان نہیں لاتا بلکہ خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس کا مذہب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کا فائدہ عقل و تجربہ سے ثابت ہو جاتے تب وہ اس کو قبول کرے، اور کسی چیز کی مضرت عقلی و تجربی حیثیت سے مبرہن ہو جاتے تب وہ اس سے اجتناب کرے۔ بلکہ اس کا مذہب یہ ہے کہ جو حکم خدا اور رسول سے ثابت ہو جاتے وہ واجب الاتباع ہے اور جو ثابت نہ ہو وہ قابلِ اتباع نہیں۔

پس یہاں اصلی سوال یہی ہے کہ آپ کا ایمان عقل اور تجربہ پر ہے یا خدا اور اس کے رسول پر؟ اگر پہلی بات ہے تو آپ کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر آپ

کو مسلمان بن کر گفتگو کرنے اور مسلمانوں کو آرمن فیر ذی فرع کی نام نہاد سنّت" سے
اجتناب کا مشورہ دینے کا کیا حق ہے اور اگر دوسری بات ہے تو مدار بحث عقلی و تجربی
فوائد نہ ہونے چاہئیں بلکہ یہ سوال ہونا چاہیئے کہ آیا قربانی محض ایک رسم ہے جس
کو مسلمانوں نے گھڑ لیا ہے یا ایک عبادت ہے جس کو اللہ نے پسند فرمایا ہے اور
اللہ کے رسول نے اپنی امت میں جاری کیا ہے؟

(ترجمان القرآن - ربیع الاوّل ۱۳۵۵ھ - جون ۱۹۳۶ء)

تجدّد کا پائے چوبیں

ماہ جون ۳۳ء کے "نگار" میں حضرت نیاز فتحپوری نے "ترجمان القرآن" پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اگرچہ عموماً رسائل وجرائد کے انتقادات پر بحث کرنے اور ان پر جوابی نقد کرنے کا دستور نہیں ہے لیکن چونکہ ناقدِ فاضل نے اپنے تبصرہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کے مذہب تجدد کے مخصوص اصول ومبادی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی اصلاح کرنا "ترجمان القرآن" کے اوّلین مقاصد میں سے ہے، اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پر اظہارِ خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ وہ لکھتے ہیں:-

> اُس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیماتِ فرقانی کو اُن کی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جیسا کہ خود فاضل اڈیٹر نے ظاہر کیا ہے، عہدِ حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں۔ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی وقدامت پرستی کا تھا، کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا۔ لیکن اب جب کہ علوم جدیدہ اور اکتشافاتِ حاضرہ نے "عقل وخیال" کی بالکل نئی طرح ڈال کر "حریتِ فکر ونظر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے، مذہب صرف اس دلیل کی

بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جواب بتایا جاتا ہے"

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محلِ نظر بتایا جاتا ہے۔ اگر پہلے رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب "علوم متفاطیسیہ" انہی معجزوں کی ذلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لیے آمادہ ہیں پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی والے خدا کو پکار سکتا تھا، لیکن آج جب کہ آسمان ہی کوئی چیز نہ رہا، اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا بلکہ "یومنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے، اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جب کہ خود نفسِ مذہب کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابلِ قبول نہیں"

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں :۔

"قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصۂ اوّل کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم

سے مختلف یا فروتر نہیں ہے۔ البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حالیہ نے انہی دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیات لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلاتے جانے کا مستحق ہوگا۔"

اس لیے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کر کے تمام ان آیات قرآنی کا استقصا کرنا چاہیئے جو عقائد و قصص کے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کر کے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہیئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔"

آخر میں وہ لکھتے ہیں:۔

"آئندہ کے سلسلے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے۔ اور مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت ولامذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کروں گا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ "ناچار مسلمان شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، ان کا ایک بڑا سبب عقیدۂ معاد بھی ہے۔"

فاضل مبصر نے جن فروعی و جزئی مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں ان کو چھوڑ کر

میں صرف اُن امور سے بحث کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اصول سے ہے۔

انہوں نے قرآن مجید کے مباحث کی تقسیم تین حصوں پر کی ہے۔ لیکن ہم بآسانی ان کو صرف دو حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ حصّہ جن کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے علم کی حدود سے باہر ہیں۔ ہمارے ادراک کی سرحد سے ماوراء ہیں، جن کے متعلق ہم قطعیت کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے اور جن میں قرآن ہم کو ایمان بالغیب لانے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسرے وہ امور جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں، اور جن میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم عقلی لگانا ہمارے لیے ممکن ہے۔ پہلے حصّہ میں وجود و صفاتِ الٰہی، فرشتے، وحی و کتبِ آسمانی، حقیقتِ نبوت، بعث بعد الموت، عذاب و ثوابِ آخرت، اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے علاوہ وہ تمام ماوراءے سرحدِ علم و ادراک باتیں بھی آجاتی ہیں جو قصص اور تمثیلات کے سلسلے میں وارد ہوتی ہیں، عام اس سے کہ وہ بالذات عام انسانی ادراک کی سرحد سے ماوراء ہوں، یا اس بنا پر ایسی ہوں کہ سرِدست ہم جس مرتبۂ عقلی و علمی میں ہیں اس میں ہم ان کی صحت و صداقت کے متعلق کوئی حکم لگانے کے قابل نہیں ہیں۔ دوسرے حصّہ میں وہ تمام امور آجاتے ہیں جن کا تعلق اسلام کی تعلیم حکمت و تزکیۂ نفوس اور تنظیم حیاتِ انسانی کے اصول سے ہے۔

ناقد فاضل کی رائے میں دوسرے حصّے سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس بارے میں جیسے اور مذاہب ہیں ویسا ہی اسلام بھی ہے۔ البتہ بحث صرف پہلے حصّہ سے کی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں میں ریب و تذبذب کی کیفیت انہی امور کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے جو اس حصّے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر

یہ سوال کہ ان امور کے متعلق ریب و تذبذب کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ عہد ماضی میں تو قدامت پرستی اور جہالت کی وجہ سے لوگ غیب کی باتوں پر ایمان لے آتے تھے، لیکن اب علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریت فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ اس لیے اب "یومنون بالغیب" کا زمانہ نہیں رہا بلکہ "یومنون بالتجربہ والشہود" کا زمانہ ہے۔

اس راستے کی بنیاد چند غلطیوں پر ہے جن میں پہلی غلطی گزشتہ اور موجودہ زمانہ کے حقیقی فرق کو نہ سمجھنا ہے۔ بدقسمتی سے تنہا حضرت نیاز ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا گروہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مذہب کی شمع صرف گزشتہ زمانے کی تاریکی میں جل سکتی تھی۔ علوم جدیدہ کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد اس کا روشن ہونا مشکل ہے۔ حالانکہ علوم عقلیہ جن کو یہ لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں کچھ اس زمانہ کی مخصوص متاع نہیں ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بھی ان علوم کی روشنی نے آنکھوں کو اسی طرح خیرہ کیا ہے اور گزشتہ زمانے میں بھی جن لوگوں کی آنکھیں ان سے خیرہ ہوئی ہیں، انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ مذہب کی شمع اب روشن نہیں رہ سکتی۔ جو علوم اس زمانہ کے "علوم جدیدہ" اور جو اکتشافات اس زمانے کے "اکتشافات حاضرہ" تھے، وہ ان کے زعم میں عمل و خیال کی بالکل نئی طرحیں ڈال چکے تھے اور انہوں نے دماغوں کو حریت فکر و ضمیر کی دولت سے ایسا مالا مال کیا تھا کہ ان کے روشن زمانہ میں "یومنون بالغیب" کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کیا بالکل یہی حالت دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی تک نہیں گزری ہے، افلاطون، ارسطو، اپیکورس، زینو، برقلس، اسکندر، فردوسی،

فلاطینوس، اور دوسرے علمائے فلسفہ و حکمت کے خیالات جب اسلامی ممالک میں شائع ہوتے اور ان کی بدولت فلسفیانہ تفکر اور عقلی اجتہاد کا ایک نیا دور شروع ہوا تو کیا اس وقت بھی ایک گروہ نے بالکل یہی نہ سمجھا تھا جو اب ایک گروہ سمجھ رہا ہے؟ کیا اس زمانہ کی حریتِ فکر و ضمیر اور "عمل و خیال کی نئی طرح" نے اسی طرح لوگوں کو مذہبی معتقدات کی طرف سے ریب و شک میں نہ ڈال دیا تھا؟ مگر پھر کیا ہوا؟ فلاسفہ کے بہت سے نظری و قیاسی مسائل جن پر اس وقت کے لوگ ایمان لے آئے تھے، بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ وہ آفتابِ علم جن کے سامنے ان لوگوں کو مذہب کی شمع ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی زمانہ کی ایک ہی گردش میں بے نور ہو کر رہ گیا۔ ان کے "علوم جدیدہ" فرسودہ ہو گئے۔ ان کے "اکتشافاتِ حاضرہ" میں "عمل و خیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کی قوت باقی نہ رہی، اور جو طرحیں انہوں نے ڈالی تھیں وہ سب پرانی ہو گئیں۔ حتیٰ کہ اپنے زمانہ کے اکتشافات پر کامل یقین و اذعان رکھتے ہوئے انہوں نے جو عقلی استدلالات کئے تھے اور ان پر جن مذاہبِ حکمت کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے اکثر کو آج ایک معمولی طالب علم بھی لغو و مہمل قرار دینے میں تامل نہیں کرتا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ گزشتہ زمانہ کی تاریکی میں مذہب کی شمع جل سکتی تھی مگر اب اس روشنی کے زمانہ میں نہیں جل سکتی، تو ہمیں بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ جن چیزوں کو آج علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ کہہ کر وہی دعوے کئے جا رہے ہیں جو پہلے کئے تھے، ان کے متعلق بھی ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر کا وہی حشر ہونا ہے جو گزشتہ لوگوں کے "علوم جدیدہ" اور "اکتشافات حاضرہ" کا ہو چکا ہے اور "عمل و خیال کی یہ نئی طرحیں" بھی زمانہ کی گردش

کے ساتھ پرانی اور فرسودہ ہو جانے والی ہیں۔ آپ ان تمام علوم و اکتشافات پر ایک غائر نظر ڈالیے جو آپ کا سرمایہ فخر و ناز ہیں، اور خود ان لوگوں سے جو ان علوم و اکتشافات کے اصلی محقق اور مکتشف ہیں دریافت کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ گزشتہ علوم کی طرح ان میں بھی ایسے یقینیات بہت کم ہیں جن کے متعلق اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہو کہ ان کے غلط ثابت ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ باقی جتنی چیزیں ہیں سب ظنون، قیاسات نظریات، ارتیابات اور تذبذبات ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کی جانب زمانہ کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جاتے گا "یہ علوم جدیدہ" اور "اکتشافات حاضرہ" قدامت کا لباسِ عار پہنتے جائیں گے اور عمل و خیال کی نئی طرحیں جو ان ناپائدار علوم و اکتشافات کے بھروسہ پر پڑی ہیں، کچھ دوسری نئی طرحوں کے لیے جگہ خالی کرتی جائیں گی۔

پس جب حال یہ ہے تو ایک ہوشمند اور بالغ النظر آدمی کے لیے اس خیال سے ہیبت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب "علوم جدیدہ" اور "اکتشافات حاضرہ" نے عمل و خیال کی نئی طرحیں ڈال دی ہیں" اور "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالامال کر دیا ہے، لہٰذا اب خدا جانے مذہب کا کیا حشر ہو۔ وہ تو ان علوم و اکتشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈال کر یہ دیکھے گا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں۔ اگر فی الواقع وہ یقینیات ہوں اور مذہب کے حقیقی معتقدات سے متصادم بھی ہوں تو بلاشبہ اس کے لیے یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ مذہب پر ایمان لاتے یا ان یقینی نتائج تحقیق پر؟ لیکن اگر وہ محض قیاسات و نظریات ہوں یا محض شک اور تذبذب میں ڈالنے والی چیزیں ہوں تو وہ ان کے اور مذہب کے تصادم سے

ہرگز نہ گھبراتے کیونکہ مذہب کی بنیاد اگر یقین و اذعان پر ہے تو یقین و اذعان کے مقابلہ میں ظن و قیاس اور شک و تذبذب کو ہرگز کوئی ترجیح حاصل نہیں۔ اور اگر مذہب کوئی ظنی و قیاسی چیز ہے تو اسی ظن و قیاس پر تو جدید علمی نظریات کی بنیاد بھی ہے۔ پھر دونوں میں وجہ ترجیح کیا چیز ہے؟

علوم جدیدہ و انکشافات حاضرہ سے مرعوب ہو کر مذہب کی طرف ایک ترمیم طلب نگاہ ڈالنا تو صرف ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کے دل میں یہ تخیل گھر کر گیا ہے کہ نئی چیز علم و انکشاف ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اس کو قبول کر لینا یا اس پر ایمان لے آنا ضروری ہے، خواہ اس کی حیثیت محض قیاسی و نظری ہو اور خواہ اس کو انہوں نے گہری علمی بصیرت کے ساتھ نقد صحیح کی کسوٹی پر پرکھا بھی نہ ہو۔ ایسے ہی لوگوں میں "عمل و خیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ عمل و خیال کی نئی طرحیں کیونکر پڑتی ہیں، اور کونسی طرحیں عاقلانہ ہوتی ہیں اور کونسی محض طفلانہ۔ اسی طرح حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سے مالا مال ہونے کا ادعا بھی ایسے ہی سطحی النظر لوگوں کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے مگر انہیں معلوم نہیں کہ مجرد حریتِ فکر و ضمیر ایک فتنہ اور ایک خطرناک حالت ہے، اگر اس کے ساتھ ایک وسیع اور پختہ علم، ایک عمیق اور بالغ نظر، ایک متوازن اور صحیح الفکر دماغ نہ ہو، اور یہ وہ چیز ہے جس کو عطا کرنے میں قدرت نے اتنی فیاضی سے کام نہیں لیا جتنی آج کل فرض کر لی گئی ہے۔

دوسرا نظریہ جو اسی پہلے نظریہ سے نکلا ہے، یہ ہے کہ اب زمانہ "یؤمنون بالغیب" کا نہیں رہا بلکہ "یؤمنون بالتجربۃ والشھود" کا ہے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد بھی

نہیں سمجھ سکا کہ ان الفاظ سے قائل کا حقیقی مقصود کیا ہے اگر مقصود یہ ہے کہ زمانہ میں کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جاتی جس پر غیب کا اطلاق ہوتا ہو اور جس کا تجربہ یا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو تو یہ بالکل غلط ہے۔ ایسے کہنے کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ اس زمانہ میں لوگوں نے صرف اسی حد کے اندر محدود رہنا قبول کرلیا ہے جس میں ان کا تجربہ و مشاہدہ ان کے لیے وسیلہ اکتساب علم بن سکتا ہے اور جس میں ان کے حواس کام دے سکتے ہیں، اور اس دائرے کے باہر جتنے امور ہیں ان کے بارے میں فکر کرنا اور قیاس و استقراء سے ان کے متعلق حکم لگانا انسان نے چھوڑ دیا ہے۔ مگر کوئی شخص جس نے علوم جدیدہ و اکتشافات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، اس بیان کو تسلیم نہ کرے گا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو چھوڑیے جس کی بحث تمام تر امور غیب سے ہے۔ خود سائنس اور اس کے امور طبیعیہ کو لے لیجئے جن کے اعتماد پر آپ "ایمان بالتجربہ والشہود" کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس فن کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کی تحقیقات کا مدار قوت، انرجی، قانون، فطرت، مادہ، رشتہ، علت و معلول اور ایسے ہی دوسرے امور کے اقرار و اثبات پر نہیں؟ کونسا عالم طبیعیات ایسا ہے جو ان چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا؟ اب ذرا کسی بڑے سے بڑے حکیم سے جاکر پوچھئے کہ ان میں سے کس کی حقیقت وہ جانتا ہے؟ کس کس کی کنہ تک اس کے حواس پہنچ سکے ہیں؟ کس کے نفس وجود کا تجربہ و مشاہدہ اس نے کرلیا ہے؟ اور کس کے موجود ہونے کا حقیقی ثبوت وہ پیش کرسکتا ہے؟ پھر یہ غیب پر ایمان نہیں تو کیا ہے؟

ان الفاظ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی بات مانی جاتی ہے جس کا تمام انسانوں نے تجربہ و مشاہدہ کیا ہے اور جو نوع انسانی

کے تمام افراد کے لیے شہود و حضور کا مرتبہ رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسی بات ہے جو کسی مرد عاقل کی زبان سے نہیں نکل سکتی اس لیے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تمام انسانی معلومات افراد انسانی کو فرداً فرداً حاصل نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں مخصوص جماعتوں اور مخصوص افراد کو اختصاص کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ ان خصوصی معلومات کا ہر شعبہ صرف اپنے مختص عالموں کے لیے حاضر اور باقی تمام انسانوں کے لیے غائب ہوتا ہے اور جمہور کو اس شخص یا اس گروہ پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے جو اس شعبہ کا عالم ہو۔

تیسرا مفہوم اس قضیہ کلیہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کا ہر شخص صرف وہی بات مانتا ہے جو اس کے ذاتی تجربے یا مشاہدے میں آئی ہو، اور ایسی کسی بات کو نہیں مانتا جو خود اس کے لیے غیب کا حکم رکھتی ہو۔ لیکن یہ ایسی بات ہے کہ اس سے زیادہ مہمل کوئی بات انسانی دماغ سے نکل نہیں سکتی۔ اس صفت کا نہ کوئی آدمی کبھی پایا گیا ہے، نہ آج پایا جاتا ہے، نہ قیامت تک اس کے پائے جانے کی اُمید ہے۔ اور اگر وہ فی الواقع کہیں موجود ہے تو اس کی نشان دہی کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہیئے کیونکہ انکشافات حاضرہ میں یہ انکشاف سب سے زیادہ اہم ہوگا۔

غرض آپ خواہ کسی پہلو سے اس فقرہ کو دیکھیں اس میں کوئی صداقت آپ کو نظر نہ آئے گی۔ خود تجربہ و مشاہدہ ہی اس پر گواہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اسی طرح یومنون بالغیب کا ہے جس طرح گزشتہ زمانہ تھا اور ایمان بالغیب جس چیز کا نام ہے اس سے انسان کو نہ کبھی چھٹکارا ملا ہے نہ مل سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے ۹۹۹ فی ہزار بلکہ اس سے زیادہ معاملات میں ایمان بالغیب لاتا ہے اور لانے پر مجبور ہے۔ اگر وہ یہ عہد کرلے

کہ صرف اپنے تجربہ و مشاہدہ پر ہی ایمان لائے گا تو اس کو معلومات کا وہ تمام ذخیرہ اپنے دماغ سے خارج کر دینا پڑے گا جسے دوسروں پر اعتماد کر کے اس نے مقام علم و یقین میں جگہ دی ہے، اکتساب علم کے ان تمام ذرائع کا مقاطعہ کر دینا پڑے گا جو خود اس کے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے ماسوی ہیں، اور یہ ایسی حالت ہو گی جس میں وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گا، کجا کہ دنیا کا کوئی کام کر سکے۔ درحقیقت ایمان بالغیب کی کلی نفی اور ایمان بالتجربہ والشہود کا کلی اثبات نہ اس زمانہ میں ممکن ہے اور نہ اس سے بھی زیادہ روشن کسی زمانہ میں ہونے کی توقع ہے۔ لامحالہ ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان مجبور ہے کہ اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے بغیر بہت سی باتیں محض دوسروں کے اعتماد پر مان لے۔ کچھ باتیں اس کو خبر متواتر کی بنا پر ماننی پڑتی ہیں، جیسے یہ کہ سنکھیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے اور آنحالیکہ ہر شخص نے نہ خود سنکھیا کھا کر اس کا تجربہ کیا نہ کسی کو کھا کر مرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ باتوں کو ایک یا چند معتبر آدمیوں کی روایت سے مان لینا پڑتا ہے، جیسے عدالتوں کا شہادت پر اعتماد، کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کی مشین ایک لمحہ کے لیے بھی حرکت نہ کر سکے۔ کچھ باتیں صرف اس بنا پر تسلیم کر لینی پڑتی ہیں کہ ان کو ایک ماہر فن کہہ رہا ہے۔ یہ حالت ہر مدرسہ اور ہر کالج میں ہر طالب علم پر گزرتی ہے۔ اگر وہ اپنے فن کے اکابر علماء و ماہرین کی تحقیقات اور ان کے اکتشافات و نظریات پر ایمان بالغیب نہ لاتے تو علم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ کبھی ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں وہ خود ان علماء و ماہرین کی طرح حقائق علمیہ کی تحقیق کرنے کے قابل ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم ان تمام معاملات میں دوسروں پر ایمان بالغیب

لاتے ہیں اور لانے پر مجبور ہیں جن میں ہم نے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے اکتسابِ علم نہیں کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے کہ کس معاملہ میں کس پر ایمان بالغیب لانا چاہیئے؟ اصولاً یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملہ میں صرف اس شخص یا جماعت پر ایمان لانا چاہیئے جس کے متعلق ہم کو یہ اطمینان ہو کہ اسے اس معاملہ کا بہتر علم حاصل ہے اور اس کے پاس اس کے جاننے کے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ اسی قاعدۂ کلیہ کے ماتحت ایک مریض ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل سے مشورہ نہیں کرتا، اور ایک اہلِ مقدمہ وکیل کو چھوڑ کر انجینیر کے پاس نہیں جاتا۔ لیکن الٰہیات و روحانیت کے مسائل میں یہ اختلاف واقع ہوتا ہے کہ آیا ان میں علمائے فلسفہ و ماہرینِ علومِ عقلیہ کی رائے تسلیم کی جائے یا عالمِ انسانی کے مذہبی و روحانی پیشواؤں کی؟ خدا اور ملائکہ، وحی و الہام، روح اور حیات بعد الموت، عذاب و ثوابِ آخرت اور ایسے ہی دوسرے امورِ غیب میں کانٹ اور اسپنسر، آئین شتائین اور برگساں جیسے لوگوں کی بات مانی جائے، یا ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام جیسے بزرگوں کی؟ "حریتِ فکر و ضمیر" کے مدعیوں کا رجحان پہلے گروہ کی جانب ہے اور وہ انہی کی مہیا کی ہوئی کسوٹی پر گروہِ انبیاء کی باتوں کو کس کر دیکھتے ہیں۔ جو باتیں اس کسوٹی پر کھری نکلتی ہیں انہیں مان لیتے ہیں، اس لیے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے کہی ہیں، بلکہ اس لیے کہ حکماء و فلاسفہ نے ان کو شرفِ قبول عطا کیا ہے اور بدقسمتی سے ایسی باتیں بہت ہی کم بلکہ بالکل نہیں ہیں۔ اور جو باتیں اس کسوٹی پر کھوٹی نکلتی ہیں ان کو وہ غیر معتبر قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے "قدامت پرستوں" اور "اسلاف پرستوں" کا مسلک یہ ہے کہ نہ طبیعات و عقلیات

کی باتیں الٰہیات و روحانیات والوں سے پوچھو اور نہ اس کے برعکس الٰہیات و روحانیت کی باتیں عقلیات و طبیعیات والوں سے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور ایک علم میں دوسرے علم کے ماہر کی رائے دریافت کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ حکماء و فلاسفہ اپنے عقلی علوم میں خواہ کتنی ہی اعلیٰ بصیرت رکھتے ہوں لیکن علوم الٰہیہ میں ان کا مرتبہ ایک عامی سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ان کے متعلق معلومات کے اتنے ہی ذرائع رکھتے ہیں جتنے ہر معمولی انسان رکھتا ہے۔ یہ علوم مخصوص ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، وہی ان کے ماہر ہیں اور انہی کے پاس ان کے جاننے کے اصلی ذرائع ہیں۔ اس لیے ان کے مسائل میں انہی پر ایمان بالغیب لانا چاہیئے۔ آپ کے لیے بحث و کلام کی اگر گنجائش ہے تو وہ صرف اس امر میں ہے کہ آیا فی الواقع وہ سچے اور علوم الٰہیہ میں صاحبِ بصیرتِ تامہ ہیں یا نہیں۔ مگر جب یہ بات ثابت ہو جائے یا ثابت کر دی جائے کہ فی الحقیقت وہ ایسے ہیں تو پھر جو باتیں اپنی بصیرت اور اپنے علم کی بنا پر انہوں نے بیان کی ہیں وہ سب آپ کو ماننی پڑیں گی۔ ان سے انکار کرنا اور ان کے خلاف دلیل و حجت لانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے اندھا سورج کے وجود سے انکار کردے اور آنکھوں والوں کو جھٹلانے کے لیے وجودِ شمس کے امتناع پر دلیلیں پیش کرے۔ ایسا شخص اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو مگر جو اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ رہا ہے وہ اس نابینا کے متعلق جو کچھ رائے قائم کرے گا اس کے بیان کی حاجت نہیں۔

آپ کہیں گے کہ انبیا علیہم السلام نے امورِ غیب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی تائید "علوم جدیدہ" اور "اکتشافات حاضرہ" سے نہیں ہوتی، اس لئے لوگ

"زیب وتہذیب" میں مبتلا اور "ناچار مسلماں شو" کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ مگر میں کہوں گا کہ ان علوم واکتشافات میں وہ کونسے یقینیات ہیں جو اصولِ اسلام سے ٹکراتے ہیں؟ اگر ہیں تو انہیں پیش فرمائیے تاکہ ہم بھی غور کریں کہ آیا قرآن کو مانیں یا علوم جدیدہ واکتشافاتِ حاضرہ کو۔ اور اگر نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں۔ جیسا کہ خود آپ کے الفاظ "زیب وتہذیب" اور "ناچار مسلماں شو" سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو پھر کیا علوم جدیدہ واکتشافات حاضرہ کے اسلحہ خانے میں صرف ظنیات وقیاسات ہی کے وہ ہتھیار ہیں جن کے بل پر وہ مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہیں اور جن کی کاٹ نہیں، محض چمک دمک دیکھ کر آجکل کے "اربابِ حریتِ فکر وضمیر" یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہب ان کا نام سنتے ہی سہم جائے گا اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا؟ آپ ان علوم واکتشافات کو خواہ کتنی ہی اہمیت دیں، مگر یاد رکھیے کہ امورِ غیب میں وہ ہرگز مفید یقین نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ آپ "زیب وتہذیب" میں پڑ جائیں اور کہیں کہ ہم وحی والہام، بعث بعد الموت، عذاب وثوابِ آخرت، فرشتوں کے وجود اور خود خدا کے وجود کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو "ناچار مسلماں شو" کی لعنت سے نکال لئے اور "کافر توانی شد" کی برکت سے مالا مال ہونے میں یہ علوم کچھ بھی مدد دے سکیں۔ کیونکہ امورِ مذکورہ بالا سے قطعی انکار کر دینے کے لیے یہ علوم کوئی حجت فراہم نہیں کرتے، اور کسی چیز کے عدم کا حکم لگانے کے لیے صرف اتنی حجت کافی نہیں ہے کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔ پس "زیب وتہذیب" کا مقام وہ آخری مقام ہے جہاں آپ کے "علوم جدیدہ واکتشافات حاضرہ" آپ کو

سے جاکر چھوڑ دیتے ہیں مگر عقلی و ذہنی حیثیت سے یہ ایک بدترین مقام ہے۔ جو علوم انسان کو یقین نہ بخش سکیں، جو اسے ایک ایسے مقام پر معلق چھوڑ دیں جہاں اس کو کوئی جائے قرار نہ ملتی ہو، جو اُسے کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو کی دلدل میں لے جاکر پھنسا دیں وہ یقیناً جہل سے بدتر ہیں۔

اس مشکل سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایمان بالغیب ہے۔ ایک دفعہ جب آپ نے ایک شخص کو نبی مان لیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت رکھتا ہے اور یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر آپ کے لیے امور غیب میں کسی تذبذب و ریب کی گنجائش نہیں رہتی اور آپ کا اعتقاد یقین و اذعان کی ایک ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے جسے کسی علم جدید و اکتشاف حاضر اور عمل و خیال کی کسی نئی طرح اور حریت فکر و ضمیر کی کسی گرم بازاری سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لیے اور متقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرہ ۔ ۱) ایمان بالغیب پر مذہب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر آپ نے اس اصل الاصول کو منہدم کر دیا تو پھر مذہب کے ان بنیادی معتقدات کے متعلق جن کی حقیقت معلوم کرنے کا خود آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، آپ کسی ایسی راستے پر نہیں پہنچ سکتے جس کی صحت کا خود آپ کو یقین ہو اور جس کی صداقت کا آپ دوسروں کو یقین دلا سکیں۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے پاس یہ دریافت کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ وہ نبی ہے، اس کو علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت حاصل ہے

اور وہ اس مرتبہ کا صادق انسان ہے کہ اگر وہ امور غیب کے متعلق ہم کو ایسی باتیں سناتے جو ہماری عقل سے ماوراء اور ہمارے دائرہ علم سے باہر ہوں تب بھی ہم اس کی بات پر ایمان لے آئیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے؟ اس سوال کا تصفیہ منحصر ہے دو چیزوں پر۔ ایک یہ کہ ہم اس شخص کی سیرت کو اس سخت سے سخت معیار پر جانچ کر دیکھیں جس پر کسی انسان کی سیرت جانچی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس کی پیش کی ہوئی ان باتوں پر نگاہ ڈالیں جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ ایک حکم عقلی لگانا ہمارے لیے ممکن ہے۔ جب ان دونوں امتحانوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے صادق القول ہونے میں بے مثل ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے تمام عملی و فکری شعبوں میں خیر و صلاح و حکمت کی ایسی کامل تعلیم دیتا ہے جس میں انسانی عقل کہیں سے کوئی عیب نہیں نکال سکتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو سچا نہ مانیں اور بدگمانی کریں کہ اس نے کسی علم و واقفیت کے بغیر محض دنیا کو دھوکا دینے کے لیے خدا اور فرشتوں اور عرش و کرسی اور وحی و الہام اور بعث بعد الموت اور دوزخ و جنت کا اتنا بڑا فریب گھڑ کر رکھ دیا ہے۔

پس حضرت نیاز کی تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ قرآن کے پہلے حصہ کو جسے ہم نے اپنی تقسیم میں دوسرا حصہ قرار دیا ہے، قابل بحث نہیں سمجھتے اور مزید برآں یہ خیال کرتے ہیں کہ "اس معاملہ میں تمام مذاہب تقریباً یکساں ہیں، اور مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فرد تر نہیں ہے۔" برعکس اس کے ہم کہتے ہیں کہ ان کی تقسیم کے مطابق قرآن کے دوسرے اور تیسرے جتنے دیا ہماری تقسیم

کے مطابق پہلے حصّے) کی صداقت کا فیصلہ منحصر ہی اس پر ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن مجید کے ان تمام حصّوں کی ناقدانہ چھان بین کریں جن کا تعلق امورِ غیب سے نہیں ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ اسلام کی تعلیم کا یہ حصّہ دوسرے مذاہب سے مختلف یا فروتر نہیں ہے بلکہ بدلائل یہ ثابت کریں کہ وہ تمام ان مذاہب سے جو غیر اسلام ہیں اعلیٰ وارفع واجل ہے۔ جب تک بحث کا یہ مرحلہ طے نہ ہو جاتے دوسرے مرحلے (یعنی امورِ غیب کی بحث) میں قدم رکھنا اصولاً غلط ہے اور اس کے تصفیہ کے بغیر ان کا تصفیہ ممکن نہیں ہے۔

حضرت نیاز چاہتے ہیں کہ ہم "معاد" اور "کلام الٰہی" اور ان آیات سے بحث کریں جو عقائد اور قصص سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس بحث کے دو پہلو ہیں اور وہ دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور اس بنا پر ان میں شک کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے مگر امورِ غیب میں اس کو شکوک و شبہات ہیں۔ ان دونوں گروہوں سے بحث کرنے کے طریقے مختلف ہیں اور جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ معترض کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس وقت تک ہم اس سے بحث نہیں کر سکتے۔

پہلے گروہ سے معاد اور کلام الٰہی اور دوسرے امورِ غیب پر بحث کرنا بالکل بے نتیجہ ہے۔ کیونکہ اصل میں اختلاف رہتے ہوتے فروع پر بحث کر کے نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ہم معاد اور کلام الٰہی حتیٰ کہ خود وجود و صفاتِ الٰہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں ان پر ہمارا ایمان و یقین اس بنا پر نہیں ہے کہ

ہماری اپنی عقلی تحقیق یا ہمارے اپنے ذاتی تجربہ ومشاہدہ نے ان کے متعلق ہمیں کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہے جس کے خلاف ہم پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کی جا سکتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر ان مسائل سے بحث کی جا سکتی تھی۔ لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان واذعان کی بنیاد دراصل اس اعتقاد پر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق القول ہیں اور اپنی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ اسی اصل سے وہ بات متفرع ہوتی ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے منکر سے ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرا لیں گے اس وقت تک کسی فرعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔

رہا دوسرا گروہ تو اس کے حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو تسلیم بھی کرے اور پھر امورِ غیب پر اس جہت سے کلام بھی کرے کہ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خبریں دی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط؟ اس لیے کہ یہ پہلو اختیار کرتے ہی وہ پہلے گروہ میں شامل ہو جاتے گا۔ اگر وہ حقیقت میں دوسرے گروہ کا آدمی ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ قرآن کا ہر لفظ صحیح ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا وہ غلطی سے مبرا ہے۔ البتہ وہ اس پر دو پہلوؤں سے کلام کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ آیا فی الواقع قرآن میں ایسا اور ایسا ارشاد ہوا ہے یا نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اور ایسا فرمایا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ فی الواقع ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

آخر میں ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔ حضرت نیاز نے رائے دی ہے کہ ترجمان القرآن میں ایک باب المناظرہ کھولا جائے اور ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ وہ اپنے شبہات و اعتراضات بھی پیش کریں گے۔ جہاں تک اصطلاحی مناظرہ کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس سے دامن بچایا ہے اور اب بھی بچانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسی بحث کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں جس کا مقصد محض دماغی ورزش اور عقلی کشتی ہو۔ رہا علمی مناظرہ جس کا مقصد احقاق و تحقیق ہو اور جس میں فریقین اس دلی خواہش کے ساتھ شریک ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک حق ہے اس کا اظہار کریں گے اور جو کچھ حق ثابت ہو جائے گا اس کو تسلیم کر لیں گے، تو اس کے لیے میں ہر وقت آمادہ ہوں۔ "نگار" میں جن شبہات و اعتراضات کو پیش کیا جائے گا وہ بجنسہٖ ترجمان القرآن میں نقل کئے جائیں گے اور پھر جواب دیا جائے گا۔ اسی طرح اُمید ہے کہ ترجمان القرآن کے جواب پر اگر حضرت نیاز کوئی تنقید فرمائیں گے تو اصل جواب بھی اس کے ساتھ نقل فرمائیں گے، تاکہ دونوں رسالوں کے ناظرین بحث کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں، اور خود بھی کوئی رائے قائم کر سکیں۔ صرف ایک پہلو کو پیش کرنا اور دوسرے پہلو کو پیش کرنے سے احتراز کرنا میرے نزدیک خود اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۲ھ جولائی ۱۹۳۳ء)

نوٹ

یہ امر ناظرین کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اس مضمون کے جواب میں

ترجمان القرآن کا نیا دور جریدہ تلاش سے بند ہو گیا اور آج تک بند ہے۔ کچھ لوگ ہمارے نیم پختہ نوجوانوں کو چند ظاہر فریب باتوں سے بہکانے کا کام تو خوب کر لیتے ہیں مگر علمی طریقہ پر باقاعدہ اور اصولی بحث کا جب موقع آتا ہے تو ان کا پائے چوبیں سخت بے تمکین ثابت ہوتا ہے۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص

مسلم یونیورسٹی کورٹ نے اپنے گزشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء) میں ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے جو ایک عرصہ سے توجہ کا محتاج تھا، یعنی دینیات اور علوم اسلامیہ کے ناقص طرزِ تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبا میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت جہاں تک جدید علوم و فنون اور ادبیات کی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں اس کا بہتر سے بہتر انتظام موجود ہے۔ کم از کم اتنا ہی بہتر جتنا خود علی گڑھ میں ہے۔ محض اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک الگ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک مستقل قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا تخیل جس بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پوری نہیں ہوتی۔ اسی کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی اپنی یونیورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے، اگر وہاں سے بھی ویسے ہی گریجویٹ نکلیں جیسے سرکاری یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، اگر وہاں بھی محض دیسی "صاحب لوگ" یا ہندی وطن پرست یا اشترا کی ملاحدہ ہی پیدا ہوں، تو لاکھوں روپیہ کے صرف سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کونسی خاص ضرورت ہے۔

یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی۔ جب یونیورسٹی قائم کی جا رہی تھی اس وقت سب سے پہلے اسی بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک علیحدہ یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے۔ مگر کسی نقاد نے آجکل کے مسلمانوں کی تعریف میں شاید سچ ہی کہا ہے کہ یہ کام پہلے کرتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔ جن لوگوں کو یونیورسٹی بنانے کی دھن تھی انہیں بس یونیورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی، اس کا کوئی نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا کہ ایک مسلم یونیورسٹی کیسی ہونی چاہیے اور کن خصوصیات کی بنا پر کسی یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ اس عمل بلا فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ویسی ہی ایک یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی قائم ہو گئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری لکھنؤ میں اور تیسری ڈھاکہ میں ہے۔ لفظ "مسلم" کی رعایت سے کچھ دینیات کا حصہ بھی نصاب میں شریک کر دیا گیا تاکہ جب کوئی دریافت کرے کہ اس یونیورسٹی کے نام میں لفظ "مسلم" کیوں رکھا گیا ہے تو اس کے سامنے قدوری اور منیۃ المصلی اور ہدایہ بطور سند اسلامیت پیش کر دی جائیں۔ مگر درحقیقت یونیورسٹی کی تاسیس و تشکیل میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں سے ممتاز ہو کر حقیقی معنوں ایک اسلامی یونیورسٹی ہوتی۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں تعمیر کے شوق اور جوش نے صحیح اور مناسب نقشہ پر غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یونیورسٹی قائم ہوتے پندرہ سال ہو گئے اور اس دوران میں ہمارے تعلیمی ناخداؤں نے ایک مرتبہ بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس کی اصل منزل مقصود کیا تھی اور ان کا بیڑا کس پشت بمنزل جا

کدھر رہا ہے۔ ابتدا سے حالات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ درسگاہ نہ اس ڈھنگ پر چل رہی ہے جس پر ایک اسلامی درسگاہ کو چلنا چاہیئے اور نہ وہ نتائج پیدا کر رہی ہے جو دراصل مطلوب تھے۔ اس کے طلبا اور ایک سرکاری یونیورسٹی کے طلبا میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی کیرکٹر، اسلامی اسپرٹ، اسلامی طرزِ عمل مفقود ہے۔ اسلامی تفکر اور اسلامی ذہنیت ناپید ہے۔ ایسے طلبا کی تعداد شاید ایک فی صدی بھی نہیں جو اس یونیورسٹی سے ایک مسلمان کی سی نظر اور مسلمان کا سا نصب العین لے کر نکلے ہوں اور جن میں یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت نے یہ قابلیت پیدا کی ہو کہ اپنے علم اور اپنے قوائے عقلیہ سے کام لے کر ملت اسلامیہ میں زندگی کی کوئی نئی روح پھونک دیتے، یا کم از کم اپنی قوم کی کوئی قابلِ ذکر علمی و عملی خدمت ہی انجام دیتے۔ نتائج کی نوعیت اگر محض سلبی ہی رہتی تب بھی غنیمت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلبا میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جن کا وجود اسلام اور اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم کے لیے نفع نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے۔ یہ لوگ روحِ اسلامی سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ قطعاً منحرف ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے صرف سرد مہری ہی نہیں بلکہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ وہ تشکیک کی حد سے گزر کر انکار کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اور ان بنیادی اصولوں کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔

حال میں خود مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نوجوانوں میں سے ایک صاحب نے جو محض اپنی سلامتِ طبع کی وجہ سے مرتد ہوتے ہوتے رہ گئے، اپنے ایک

پرائیویٹ خط میں وہاں کے حالات کی طرف چند ضمنی اشارات کیے ہیں۔ یہ خط اشاعت کے لیے نہیں لکھا گیا ہے اور نہ لکھنے والے کا مقصد خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کی کیفیت بیان کرنا ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یونیورسٹی کی باطنی کیفیت کا نہایت صحیح مرقع ہے صاحب خط نے اپنے ذہنی ارتقا کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"علی گڑھ میں مجھے اسلامی دنیا کے خارجی فتنے یعنی تفرنج کی آخری ارتقائی منزل یعنی کمیونزم سے دوچار ہونا پڑا۔ میں پہلے مغربیت کو کوئی خطرناک چیز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن علی گڑھ کے تجربات نے مجھے حقیقت سے روشناس کرا دیا۔ اسلامی ہند کے اس مرکز میں ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی موجود ہے جو اسلام سے مرتد ہو کر کمیونزم کے پُرجوش مبلغ بن گئے ہیں۔ اس جماعت میں اساتذہ میں سے کافی لوگ شامل ہیں۔ اور یہ اساتذہ تمام ذہین اور ذکی نووارد طلبا کو اپنے جال میں پھانستے ہیں۔ ان لوگوں نے کمیونزم کو اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کی حمایت اور امداد کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی عملی مسرفانہ زندگیاں ان کی بناوٹی باتوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ بلکہ انہوں نے اسے اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ ایک عالمگیر تحریک کے سایہ میں اپنی اخلاقی کمزوریوں اور اپنے ملحدانہ رجحانات طبع اور اپنی (Loose thinking) کو (Justify) کر سکیں۔ کیمونزم نے پہلے مجھے بھی دھوکا دیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اسلام ہی کا ایک (Un-authorised edition).

ہے لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے اور اس کے بنیادی نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت صرف ناقص ہی نہیں، بلکہ ان مقاصد کے بالکل برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے جن کے لیے سرسید احمد خاں اور محسن الملک اور وقار الملک وغیرہم نے ایک مسلم یونیورسٹی کی ضرورت ظاہر کی تھی اور جن کے لیے مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جوش و خروش کے ساتھ اس درسگاہ کی تعمیر کا خیر مقدم کیا تھا۔

آپ اس انجینیر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کی بنائی ہوئی موٹر آگے چلنے کے بجائے پیچھے دوڑتی ہو؟ اور وہ انجینیر آپ کی نگاہ میں کیا ماہر فن ہوگا جو اپنی بنائی ہوئی موٹر کو مسلسل اور پیہم الٹی حرکت کرتے دیکھتا ہے اور پھر بھی محسوس نہ کرے کہ اس کے نقشے میں کوئی خرابی ہے؟ غالباً ان صفات کا کوئی مکینکل انجینیر تو آپ کو نہ مل سکے گا، لیکن آپ کی قوم کے تعلیمی انجینیر جس درجہ کے ماہر فن ہیں اس کا اندازہ آپ اس امر واقعہ سے کر لیجیے کہ وہ ایک ایسی تعلیمی مشین بنانے بیٹھے تھے جس کو اسلامی نصب العین کی جانب حرکت دینا مقصود تھا، مگر جو مشین انہوں نے بنائی وہ بالکل جانب مخالف میں حرکت کرنے لگی، اور مسلسل پندرہ سال تک حرکت کرتی رہی، اور ایک دن بھی ان کو محسوس نہ ہوا کہ ان کے نقشہ تعمیر میں کیا غلطی ہے، بلکہ کوئی غلطی ہے بھی یا نہیں؟

بعد از خرابی بسیار اب یونیورسٹی کورٹ کو یاد آیا ہے کہ:۔

"مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اولیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے

طلبا میں اسلامی روح پیدا کرے۔"
اور اس غرض کے لیے اس نے سات اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ:۔

"تمام صورتِ حال کا جائزہ لے اور دینیات اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریاتِ زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جا سکے۔"

بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہایت مبارک بات ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجاتے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر اب بھی ہمارے تعلیمی انجنیروں نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ ان کی تعلیمی مشین غلط نقشے پر بنی ہے اور اپنے مقصدِ ایجاد کے خلاف اس کے چلنے کی اصلی وجہ محض بخت و اتفاق نہیں۔ بلکہ نقشۂ تاسیس و تشکیل کی خرابی ہے تو ہم خوشی کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ مضیٰ ما مضیٰ، آؤ اب اپنے پچھلے نقشے کی غلطیوں کو سمجھ لو اور ایک صحیح نقشہ پر اس مشین کو مرتب کرو۔ لیکن ہمیں شبہ ہے کہ اب بھی اپنی غلطی کا کوئی صحیح احساس ان حضرات میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے نقشے میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ محض نتائج کی خوفناک ظاہری صورت ہی سے وہ متاثر ہوتے ہیں اور بالکل سطحی نگاہ سے حالات کو دیکھ رہے ہیں۔

خدا کرے ہمارا یہ شبہ غلط ہو۔ مگر پچھلے تجربات ہم کو ایسا شبہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

پچھلی صدی کے وسط میں جب دو صدیوں کا پیہم انحطاط ایک خوفناک سیاسی انقلاب پر منتہی ہوا تھا، اس وقت مسلمانوں کے ڈوبتے ہوتے بیڑے کو سنبھالنے کے لیے پردۂ غیب سے چند ناخدا پیدا ہو گئے تھے۔ وہ وقت زیادہ غور و خوض کا نہ تھا۔ یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں تھی کہ اس شکستہ جہاز کے بجائے ایک نیا اور پائدار جہاز کس نقشے پر بنایا جاتے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال درپیش تھا کہ یہ قوم جو ڈوب رہی ہے اس کو ہلاکت سے کیونکر بچایا جاتے۔ ناخداؤں میں سے ایک گروہ نے فوراً اپنے اسی پرانے جہاز کی مرمت شروع کر دی، انہی پرانے تختوں کو جوڑ کر ان کے رخنوں کو بھرا اور پھٹے ہوتے بادبانوں کو رفو کر کے جیسے تیسے اس پڑا ہوا بھرنے کے قابل بنا لیا۔ دوسرے گروہ نے لپک کر ایک نیا دخانی جہاز کرایہ پر لے لیا اور ڈوبنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر سوار کرا دیا۔ اس طریقہ سے دونوں گروہ اس اچانک مصیبت کو ٹالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ دونوں تدبیریں صرف اس حیثیت سے کامیاب تھیں کہ انھوں نے فوری ضرورت کے لحاظ سے چارہ سازی کر دی اور ڈوبتوں کو ہلاکت سے بچا لیا۔ ان میں حکمت اور دانشمندی جو کچھ بھی تھی صرف اسی حد تک تھی۔ اب جو لوگ اس وقت کے ٹل جانے کے بعد بھی انہی دونوں تدبیروں کو ٹھیک ٹھیک انہی دونوں شکلوں پر باقی رکھنا چاہتے ہیں ان کا طرزِ عمل حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ نہ تو پرانا بادبانی جہاز اس قابل ہے کہ مسلمان صرف اسی پر بیٹھ کر ان قوموں سے مسابقت کر سکیں جن کے پاس اس سے ہزار گنی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والے کلدار جہاز ہیں۔ نہ کرایہ پر لیا ہوا دخانی جہاز اس لائق ہے کہ مسلمان اس کے ذریعہ سے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکیں،

کیونکہ اس کا سازوسامان تو سرے سے نیا ہے اور اس کی رفتار بھی تیز ہے، اور وہ کلدار بھی ہے، مگر وہ دوسروں کا جہاز ہے، اس کا ڈیزائن انہی کے مقاصد اور انہی کی ضروریات کے لیے موزوں ہے، اور اس کے رہنما اور ناخدا بھی وہی ہیں، لہٰذا اس جہاز سے ہم کبھی یہ امید نہیں کر سکتے کہ ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا، بلکہ اس کی تیز رفتاری سے الٹا خطرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت پر لے جاتے گا اور روز بروز ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے دور کرتا چلا جاتے گا۔ فوری ضرورت کے وقت تو وہ لوگ بھی حق بجانب تھے جنہوں نے پرانے جہاز کی مرمت کی، اور وہ بھی غلطی پر نہ تھے جنہوں نے کرایہ کے جہاز پر سوار ہو کر جان بچائی۔ مگر اب وہ بھی غلطی پر ہیں جو پرانے جہاز پر ڈٹے بیٹھے ہیں اور وہ بھی غلطی پر ہیں جو اسی کرایہ کے جہاز پر جمے ہوئے ہیں۔

اصلی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا اسی طریقہ پر یہ اس وقت کے گزر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد ان کے متبعین آج بھی اسی روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر ان کے رہنما انہیں چھوڑ گئے تھے، حالانکہ وہ وقت جس کے لیے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گزر چکا ہے۔ اب اجتہادِ فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے ہم کو دونوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا۔ انتہائی جرأت کرکے پرانے جہاز والوں میں سے کوئی اگر اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اسی پرانے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگا لیتا ہے، کچھ نئے طرز کا فرنیچر مہیا کر لیتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی دخانی کل خرید لاتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکا دیتی ہے کہ یہ پرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمت مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر دو چار پرانے بادبان بھی لے کر بیسویں صدی کے اس اپ ٹو ڈیٹ جہاز میں لگا تے ہوتے ہیں تاکہ اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکہ دے سکیں کہ یہ جہاز بھی "اسلامی جہاز" ہے اور لندن کے راستہ سے بھی کعبہ کو چلا جا رہا ہے۔

اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی یہ چھوٹی نمائش تا بکے؟ ایک طوفان گزر گیا۔ اب دوسرا طوفان بہت قریب ہے۔ ہندوستان میں ایک دوسرے سیاسی انقلاب کی بنا پڑ رہی ہے۔ ممالک عالم میں ایک اور بڑے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں متوقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ خطرناک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آنے والے انقلابات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی بہ نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کی اعتقادی و ایمانی و اخلاقی و عملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوتے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹکر بھی خیریت کے ساتھ سہ سکیں گے۔ ان کا پرانا جہاز دور جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں اور اس کے بادبانوں کا تار تار الگ ہو جائے۔ رہا ان کا کرایہ کا جہاز تو وہ پرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا ان کو ملت اسلامیہ سے جدا کر کے شاید ہمیشہ کے لیے ضلالت کے قعر عمیق میں لے جائے گا لَا قَدَّرَ اللّٰہُ۔ پس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان پرانے جہاز سے بھی نکلیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتریں، اور خود اپنا ایک جہاز بنائیں جس کے آلات اور کل پرزے جدید ترین ہوں، مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو، مگر نقشہ ٹھیٹھ "اسلامی جہاز" کا ہو اور اس کے انجنیر اور کپتان اور دیدبان سب وہ ہوں جو منزل کعبہ کی راہ و رسم سے باخبر ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر اب ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سرسید احمد خاں (خدا ان کو معاف کرے) کی قیادت میں علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں، تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں، اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے، مگر اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔ نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل درآمد کیا جاسکتا۔ لہٰذا وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں

کو اسی طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا۔ اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گزر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی۔ وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا، اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اس وقت صرف موہوم تھے اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنا دی، مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں "کالے فرنگی" پیدا کئے۔ اس نے ہم میں "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" پیدا کئے اور وہ بھی ایسے جن کی نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطابات، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے جہاں سے دھڑا دھڑ "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" نکل رہے ہیں۔ پھر یہ بس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا ایک مستقل مزرعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ اگر درحقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود

ہے تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور ان کو دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہٖ لے کر اپنی زرخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف بلکہ متصادم ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی؟ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی؟ ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے، اس قسم کے عملِ تعلیم سے کوئی خوشگوار پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں، مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔

اگر فی الواقع علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظرثانی کیجیے۔ ان علوم کو جوں کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔

طالب علموں کی لوحِ سادہ پر ان کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر پیدا ہوتی بھی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعہ سے، جبکہ وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے اور کسی عملی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرزِ تعلیم کو بدلنا چاہیئے۔ تمام مغربی علوم کو طلبا کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجئے اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تاکہ ہر ہر قدم پر وہ ان کے ناقص اجزا کو چھوڑتے جائیں اور صرف کارآمد حصوں کو لیتے جائیں۔

اس کے ساتھ علوم اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجئے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجئے۔ ان کی اصلی اسپرٹ دلوں میں اتار دیجئے اور ان کا صحیح تدبر دماغوں میں پیدا کیجئے۔ اس غرض کے لیے آپ کو بنا بنایا نصاب کہیں نہ ملے گا۔ ہر چیز از سرِ نو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنتِ رسولؐ کی تعلیم سب پر مقدم ہے، مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ ان کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہیئں جو قرآن اور سنت کے مغز کو پا چکے ہوں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے، مگر یہاں بھی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظمِ معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی کتابوں میں حکمتِ اسلامیہ کے نظریات، تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفۂ تاریخ کے حقائق اسی طرح ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہوگا۔

آپ کے تعلیمی سٹاف میں جو ملاحدہ اور متفرنجین بھر گئے ہیں ان کو رخصت کیجئے خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظر و فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوتے جواہر کو جمع کیجئے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسٹیم بنائیں۔

آپ کہیں گے کہ انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دے گا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر آپ اس سے پوچھئے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہر حال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ ۱۸۵۷ء کا "اینگلو محمڈن" مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جا سکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی قدیم اسلام دشمنی پر جما رہ۔ نتیجہ خود تیرے سامنے آجائے گا۔ اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں کمیونزم کی بڑھتی ہوئی وبا کا مقابلہ صحیح النسب سانڈوں اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ۔ اگست ۱۹۳۶ء)

ملّت کی تعمیرِ نو کا صحیح طریقہ

اصلاح اور انقلاب دونوں کا مقصد کسی بگڑی ہوئی حالت کا بدلنا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کے محرکات اور طریق کار میں اساسی فرق ہوا کرتا ہے۔ اصلاح کی ابتداء غور و فکر سے ہوتی ہے۔ ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ بچار کر کے انسان حالات کا جائزہ لیتا ہے، خرابی کے اسباب پر غور کرتا ہے، خرابی کے حدود کی پیمائش کرتا ہے اس کے ازالہ کی تدبیریں دریافت کرتا ہے، اور اس کو دُور کرنے کے لیے صرف اسی حد تک تخریبی قوت استعمال کرتا ہے، جس حد تک اس کا استعمال ناگزیر ہو۔ بخلاف اس کے انقلاب کی ابتداء غیظ و غضب اور جوشِ انتقام کی گرمی سے ہوتی ہے خرابی کے جواب میں ایک دوسری خرابی مہیا کی جاتی ہے۔ جس بے اعتدالی سے بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کا مقابلہ ایک دوسری بے اعتدالی سے کیا جاتا ہے۔ جو برائیوں کے ساتھ اچھائیوں کو بھی غارت کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایک اصلاح پسند کو بھی وہی کرنا پڑتا ہے جو ایک انقلاب پسند کرتا ہے۔ دونوں نشتر لیکر جسم کے ماؤف حصہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اصلاح پسند پہلے اندازہ کر لیتا ہے کہ خرابی کہاں ہے اور کتنی ہے۔ پھر نشتر کو اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے اور نشتر کے ساتھ ساتھ مرہم بھی تیار رکھتا ہے۔ لیکن انقلاب پسند اپنے جوشِ غضب میں آنکھیں بند کر کے نشتر

چلاتا ہے، اچھے بُرے کا امتیاز کئے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے، اور مرہم کا خیال اگر اس کے دل میں آتا بھی ہے تو اس وقت جب خوب قطع و برید کر لینے اور جسم کے ایک اچھے خاصے حصے کو غارت کر چکنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

عموماً جہاں خرابیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں، وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں، اور بگڑے ہوئے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے وہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے اصلاح کی کوشش کریں۔ اسی لیے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کے بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے۔ قدامت پسند اور انقلاب پسند جماعتوں میں سخت کشمکش برپا ہوتی ہے جس سے غضب و انتقام کی آگ کو زیادہ ایندھن مل جاتا ہے۔ دونوں فریق ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہائی سرحدوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں حق و صداقت کا گلا کاٹتے ہیں۔ ایک طرف سے حق کے بجائے باطل کی مدافعت میں انتہائی قوت صرف کی جاتی ہے۔ دوسری طرف حق اور باطل کا امتیاز کئے بغیر سب پر اندھا دھند حملے کئے جاتے ہیں۔ آخرکار جب انقلاب پسندوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ہر اس چیز کو تباہ کر دیتے ہیں جو قدامت پسندوں کے پاس تھی، خواہ وہ حق ہو یا باطل، صحیح ہو یا غلط۔ انقلاب ایک سیلاب کی طرح بڑھتا ہے، اور بلا امتیاز اچھے برے سب کو غارت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر کافی تخریب کر چکنے کے بعد جب عقل اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے تو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر انقلابی ذہنیت اس میں بھی نرالے انداز ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہے۔ ہر اس چیز کو چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قدامت پسندوں کے پاس تھی۔ خواہ کوئی چیز بجائے خود

صحیح ہو لیکن انقلاب کی نگاہ میں کسی چیز کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ قدیم نظام کی طرف منسوب ہو۔ اس طرح ایک کافی مدت تک نئے انقلابی اصولوں پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب نئے نئے تجربوں اور ناکامیوں سے انقلابی دماغ تھک جاتا ہے، تب کہیں جا کر وہ اس اعتدال کے نقطے پر آتا ہے جو ابتدا ہی سے اصلاح پسند کے پیش نظر تھا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابی بسیار،

موجودہ زمانے میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال بولشویک انقلاب ہے۔ نظام تمدن کی جو انتہائی بگڑی ہوئی حالت شہنشاہی روس میں قائم تھی وہ جب اہل ملک کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو اس کے جواب میں ایک انقلابی تحریک رونما ہوئی۔ یورپ کے اشتراکی اور جمہوری نظریات نے روس میں فروغ پانا شروع کیا۔ سلطنت اور اس کے پروردہ طبقوں نے اپنے ناجائز فوائد کی حفاظت کے لیے جابرانہ قوتیں استعمال کیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسندوں میں صرف شاہی مطلق العنانی اور دولت کی ناروا تقسیم ہی کے خلاف نہیں، بلکہ اس پورے نظام تمدن کے خلاف جو صدیوں سے متوارث چلا آرہا تھا غضب کے جذبات بھڑکنے لگے۔ آخر کار مارکس کے ہیولیٰ نے لینن کی صورت اختیار کی۔ زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا، اور اس کے ساتھ ان تمام سیاسی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، مذہبی اصولوں کو بھی یک قلم مٹا دیا گیا جن پر انقلاب سے پہلے کی سوسائٹی قائم تھی۔ اس کامل تخریب کے بعد بالکل نئے اشتراکی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر شروع کی گئی، اور ان نئے معماروں نے اپنی تمام دماغی قوتیں اس کوشش میں صرف کر دیں کہ بورژوا طبقہ

کے ترکہ میں سے ایک چیز بھی ان کی نئی عمارت میں شامل نہ ہونے پاسکے حتیٰ کہ خدا
کو بھی سوویٹ روس سے باہر نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا۔ لیکن اب جتنا جتنا زمانہ
گزرتا جاتا ہے تعمیری عقل انقلابی جنون کی جگہ لیتی جاتی ہے اور وہ انتہائی پرشورش
جو انقلاب کی ابتدا میں کارفرما تھی اعتدال کے نقطہ کی طرف واپس ہوتی جا رہی ہے۔
ایسی ہی انتہا پسندی انقلاب فرانس کے زمانہ میں بھی رونما ہوئی تھی۔ اس وقت
بھی جوش انقلاب میں اچھے اور برے سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور نئے نئے
انقلابی اصول وضع کر کے ان کو رواج دیا گیا۔ لیکن اس شدید انقلابی بحران کا نتیجہ یہ ہو
کہ آج تک فرانس کا سیاسی، تمدنی اور اخلاقی مزاج پوری طرح اعتدال پر نہیں آسکا ہے۔
آج اس کی قومی زندگی کو کسی شعبہ میں بھی وہ استحکام نصیب نہیں ہے جو انگلستان کو
حاصل ہے۔

ایک اور مثال ترکی انقلاب کی ہے جہاں اسی انقلابی ذہنیت نے کوشش کی
کہ ایک قوم کو جادو کے زور سے آن کی آن میں ایک دوسری قوم بنا دیا جائے۔ اس
کوشش میں پھوڑوں اور پھنسیوں پر نشتر چلانے کے ساتھ جسم کے اچھے خاصے تندرست
حصوں کو بھی کاٹ پھینکا گیا۔ اور ان کی جگہ یورپ سے کچھ نئے اعضاء منگوا کر لگائے
گئے، حتیٰ کہ پرانے دماغ کی جگہ بھی ایک نیا دماغ نئی ٹوپی کے ساتھ حاصل کیا گیا۔ لیکن
اب مرور ایام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند ترکوں کو آہستہ آہستہ یہ سبق مل رہا ہے کہ ہر
پرانی چیز کو برا اور ہر نئی چیز کو اچھا سمجھنے کا جو قاعدہ کلیہ انہوں نے بنا لیا تھا وہ درست
نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر نئے تجربوں سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد ان کو افراط سے
اعتدال کی طرف پسپا ہونا پڑتا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ایک انقلابی بحران رونما ہے اور اس بحران کے بُرے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قدامت پسند اور انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جو ترکی اور دوسرے مسلم ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھوں میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہو گئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی نیرنگی اور وقت کے سیلانِ و تجدد سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ تمدن کے معاملات اور مسائل نے کتنے پلٹے کھا لیے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے خبر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانہ کے ساتھ چلنے سے روک دیں۔ بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب ہو سکتی ہے اور ہوئی۔ مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور معاملات رکھتی ہو وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متاثر

رہ سکتی ہے ؟ اگر اس کے رہنما اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی، علمی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہو گئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے۔ حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا، اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل بصیرت کا اجتہاد پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن و غیر متحرک شے بنا دیا ہے۔

ائمہ فقہ، متکلمین، مفسرین اور محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان کی جلالت شان سے کون انکار کر سکتا ہے ؟ مگر وہ انسان تھے۔ اکتساب علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک متحقق ہو جاتے تھے انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط کر لیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لیے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں مگر بجائے خود اصل اور منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی راستے سے

اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے۔ اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان قرآن کی آیات، اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی درحقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن سکتا ہے جس سے ہمیشہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم، ماثلکار اور قوانین اخذ کر سکتے ہیں۔ جب تک علمائے اسلام اس ماخذ و منبع سے اکتساب علم کرتے رہے اور صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی و عملی مسائل حل کرتے رہے، اس وقت تک اسلام زمانہ کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی، جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا، جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب ترک کر دیا گیا، اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتہً رک گئی، اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا، اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہو گئے، جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے اور دور از کار

مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے، اور اس دو دنیا کے ساتھ مسلمانوں میں کفر وفسق تقسیم کیا گیا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کی جگہ یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا تماشا دنیا نے دیکھا۔ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کی جگہ رُحَمَاءُ عَلَی الْکُفَّارِ اَشِدَّاءُ بَیْنَھُمْ کے مناظر ہر طرف نمایاں ہونے لگے اور تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی کی جو کیفیت منافقین اور کفار کے حق میں بیان ہوئی تھی وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔

یہ اسی حرکت کی رجعت ہے جسے آج ہم ایک خوفناک انقلابی بحران کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے مذہبی رہنما ان کی قیادت کا فرض انجام نہیں دے رہے بلکہ آگے بڑھانے کے بجائے انہیں الٹا پیچھے کھینچے لئے جاتے ہیں تو وہ ان کے قابو سے نکلنے لگے اور جیسا کہ ایک بے سری فوج کا حال ہوتا ہے انہوں نے ہر وادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ نے مذہب کے علمبرداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام خود مذہب پر تھوپا، اپنی ترقی کی راہ میں اسی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا، اور علانیہ کہنا شروع کیا کہ مذہب کو چھوڑ دو اور ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرو۔ ایک دوسرے گروہ نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینا اپنا شعار بنا لیا، گویا اب اسی سب وشتم اور سفلہ بازی میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ ایک اور گروہ اٹھا اور اس نے مذہب کی قطع و برید شروع کر دی۔ کسی نے فقہا اور ائمہ پر زبان طعن دراز کی، کسی نے فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی لپیٹ لیا، کسی نے قرآن کے احکام اور تعلیمات میں بھی ترمیم کی ضرورت سمجھی۔ کسی نے کہا کہ دین اور دنیا کو الگ الگ کر دو، دین کا تعلق صرف عقائد اور عبادات سے

رہنا چاہیئے۔ باقی رہے دنیوی معاملات تو ان میں مذہب اور اس کے قوانین کا کچھ دخل نہیں۔

اس طرح مختلف جماعتیں ان بگڑے ہوتے حالات کو بدلنے کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں۔ مگر ان کا رجحان اصلاح کی جانب نہیں بلکہ انقلاب کی جانب ہے، انہوں نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ اصل خرابی کیا ہے؟ کہاں سے پیدا ہوئی؟ کس حد تک خرابی ہے اور اس کی اصلاح کی صحیح صورت کیا ہے؟ محض تخمیناً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خرابی ہے اور اس کو دور کرنے کے لیے دیوانہ وار نشتر چلاتے جاؤ، ہے ہیں چاہے اس سے مرض کے ساتھ مریض کا بھی کیوں نہ خاتمہ ہو جائے۔

آزاد ممالک میں تو کہا جا سکتا ہے، اور یہ کہنا ایک حد تک درست بھی ہے کہ کسی انقلابی حرکت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ وہاں ایک گروہ کے ہاتھ میں حکومت کا عملی اقتدار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس اقتدار کو مٹانے میں ایک شدید انقلابی حرکت کے بغیر مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ رہے کہ انقلاب کے رہنماؤں پر جب عملاً انتظام سلطنت کی ذمہ داری آن پڑتی ہے تو زمانے کے تجربات بہت جلدی ان کی عقل درست کر دیتے ہیں اور انہیں مجبوراً افراط کی روش چھوڑ کر اعتدال کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہم اس وقت غلامی کی حالت میں ہیں، اور ہمارے حالات آزاد ممالک سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں اوّل تو کسی انقلابی حرکت کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ کسی ایسی شدید اور طاقتور مزاحمت کا خوف نہیں ہے جس کے مقابلہ میں ایک معتدل اصلاحی تحریک کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔ دوسرے اگر کوئی

انقلابی حرکت جاری ہو اور وہ کامیاب ہو جاتے تو مدت ہا تے دراز تک اس کے اعتدال پر آنے کی اُمید نہیں کی جا سکتی کیونکہ انقلاب کے علبرداروں پر سرے سے کسی ذمہ داری کا بوجھ ہی نہ ہوگا جو ان کی افراط پسندی کو اعتدال کی طرف مائل کر سکتا ہو۔ لہذا یہاں کسی انقلابی حرکت بلکہ صحیح الفاظ میں بہت سی انقلابی حرکات کے دیر تک جاری رہنے کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ مسلم سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ سب کی سب متزلزل ہو جائیں گی اور ان کی جگہ کوئی ایسی مستحکم بنیاد قائم نہ ہو سکے گی جس پر از سرِ نو ایک نظام اجتماعی تعمیر کیا جا سکے۔ پھر غور کرنا چاہیئے کہ جو قوم پہلے ہی غلامی اور کمزوری کی حالت میں ہے اس کے نظامِ اجتماعی کو اگر اس طرح منہدم کر کے پارہ پارہ کر دیا گیا تو وہ اخلاقی انحطاط کے کن گڑھوں میں جا گرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہم قدامت پسندوں سے زیادہ انقلاب پسندوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور رہوتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک بگڑے ہوتے حالات کا تعلق ہے، ان کو بدلنے کی ضرورت میں ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ جو جمود اسلام میں پیدا کر دیا گیا ہے اس کو حرکت سے بدل دیا جاتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس حرکت کے پیدا کرنے کی یہ کوئی صحیح تدبیر نہیں ہے کہ اسلامی شعار کو چھوڑ کر فرنگیت اختیار کی جاتے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ علم و تحقیق اور غور و فکر کے بغیر مذہب کی قطع و برید شروع کر دی جاتے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ گزشتہ زمانے کے مجتہدین نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے جو عمارتیں قائم کی تھیں ان کو خواہ مخواہ ڈھا دیا جاتے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ حدیث کے سارے ذخیرہ کو آگ میں جھونک دیا جاتے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ کلامِ الٰہی میں انسان اپنی عقل سے ترمیم و تنسیخ کریں۔ یہ سب تدبیریں

تو اصلاح کی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سخت فساد برپا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا جاتے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجیے جو دراصل اس کا مقام تھا۔ حدیث کو وہی مرتبہ دیجیے جو عہدِ رسالت میں خود رسولِ اکرمؐ اور آپؐ کے اصحاب و اہلِ بیت آپؐ کے اقوال و اعمال کو دیتے تھے۔ فقہا، متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجیے جو ان بزرگوں نے خود دیا تھا۔ ان سے فائدہ اٹھائیے جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انہیں بدستور رہنے دیجیے، مگر کبھی یہ نہ سمجھیے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں وہ اٹل قانون ہے، یا ان کی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غور و فکر اور احادیث نبوی کی تحقیق سے بے نیاز کر دیا ہے یا ان کے بعد کتاب و سنت سے براہِ راست اکتسابِ علم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

یہ ترتیب اگر پھر سے قائم ہو جاتے تو اسلام کی رکی ہوئی گاڑی پھر حرکت کرنے لگے گی کیونکہ جمود کی اصلی وجہ تو یہی ہے کہ انجن ریل سے کاٹ کر پیچھے کھڑا کر دیا گیا ہے، ڈرائیور کو بھی انجن سے الگ کر کے کہیں پیچھے کے ڈبوں میں بٹھا دیا گیا ہے اور سب سے آگے کے ڈبہ پر بھروسہ کر لیا گیا ہے کہ وہ خود بھی چلے گا اور ساری ریل کو بھی چلائیگا۔

مگر اس کام میں غصے اور جوش کی ضرورت نہیں۔ غصہ تو وہاں ہو جہاں عمداً کوئی ظلم کیا گیا ہو، اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے عمداً نہیں ہوا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علماء نے کہیں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ ہم اسلام پر جمود طاری کریں گے اور اس کی بڑھتی ہوئی گاڑی کو روک کر رکھ دیں گے۔ یہ تو محض نتیجہ ہے اس انحطاط کا جو چھٹی ساتویں صدی سے مسلمان قوموں کی سیاسی، فوجی، معاشی، اور تمدنی قوتوں کے ساتھ

ان کی علمی، عقلی، اور فکری قوتوں میں مسلسل رونما ہو رہا ہے اس انحطاط نے جس طرح مسلمانوں کی روحِ جہاد کو پژمردہ کیا ہے اسی طرح اِن کی روحِ اجتہاد کو بھی افسردہ کر دیا ہے۔ جس طرح زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق مسلمانوں کے نظریے بدلے اسی طرح امورِ دینی و علمی کے متعلق بھی ان کے نظریے بدل گئے اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ان کی تمام ذہنی قوتوں پر مردنی چھاتی چلی گئی۔ اس کا الزام نہ علماء کو دیا جا سکتا ہے نہ ان کے متبعین کو۔ اگر آپ چاہیں تو فطرت پر اس کا الزام رکھ دیجئے مگر نہ الزام رکھنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ غضب اور اس کے تخریبی جوش سے۔ اصلاح کی صحیح صورت بس یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے خرابیوں کے اسباب اور ان کے حدود کو تلاش کیجئے اور حکمت کے ساتھ ان کو خوبیوں سے بدل دیجئے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاوّل ۵۳ھ، جولائی ۳۴ء)

بغاوت کا ظہور

قوم دو طبقوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے، ایک طبقہ عوام، دوسرا طبقہ خواص۔ طبقہ عوام اگرچہ کثیر التعداد ہوتا ہے، اور قوم کی عددی قوت اسی طبقہ پر مبنی ہوتی ہے، لیکن سوچنے اور رہنمائی کرنے والے دماغ اس گروہ میں نہیں ہوتے۔ نہ یہ لوگ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں، نہ ان کے پاس مالی قوت ہوتی ہے، نہ یہ جاہ و منزلت رکھتے ہیں، نہ حکومت کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قوم کو چلانا ان لوگوں کا کام نہیں ہوتا، بلکہ محض چلانے والوں کے پیچھے چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ خود راہیں بنانے اور نکالنے والے نہیں ہوتے بلکہ جو راہیں ان کے لیے بنا دی جاتی ہیں انہی پر چل پڑتے ہیں۔ راہیں بنانے اور ان پر پوری قوم کے چلانے والے دراصل خواص ہوتے ہیں جن کی ہر بات اور ہر روش اپنی پشت پر دماغ، دولت، عزت اور حکومت کی طاقتیں رکھتی ہے اور قوم کو طوعاً و کرہاً انہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ قوم کی اصلی طاقت اس کے عوام نہیں بلکہ خواص ہوتے ہیں۔ انہی پر قوم کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہوتا ہے۔ ان کی راست روی پوری قوم کی راست روی پر اور ان کی گمراہی پوری قوم کی گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی بہتری کے دن آتے ہیں تو ان میں ایسے خواص پیدا ہوتے ہیں جو خود راہِ راست پر چلتے اور پوری قوم کو اس پر چلاتے ہیں۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ

فِعْلَ الْخَيْرَاتِ اور جب کسی قوم کی تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اس کے بگاڑ کی ابتدا اس کے خواص سے ہوتی ہے جن کی گمراہی اور فسادِ اخلاق سے آخر کار ساری قوم ضلالت اور بدعملیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (الاسراء ۱۶)

قرآن کی اصطلاح میں خواص قوم کو "مُتْرَفِينَ" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے خوب سرفراز کیا ہو۔ خداوند کریم کی شہادت کے مطابق ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ پہلے یہ مترفین بستیوں میں فسق و فجور اور ظلم و عدوان اختیار کرتے ہیں، پھر ساری کی ساری بستیاں بدی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اس شہادت کے صادق ہونے میں کیا کلام ہے؟ ہماری اپنی قوم کا حال دیکھ لو۔ اس کا بگاڑ بھی ہمارے مترفین ہی سے ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اس طریقے کو جو احکام الٰہی کے مطابق ہدایت کرنے والے ائمہ کا طریقہ تھا چھوڑ دیا اور شیطانی طریقوں کی پیروی شروع کر دی۔ انہی نے نفس پرستی کے لیے شریعت کی بندشیں ڈھیلی کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی نے فراعنہ اور قیاصرہ کی طرح خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرانی شروع کی اور اپنی قوم کو خدا پرستی کی جگہ بادشاہ پرستی اور امراء پرستی کا خوگر بنایا۔ انہی نے ان گردنوں کو بندوں کے آگے جھکنا سکھایا جنہیں صرف خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہی نے خوشنما لباسوں اور شاندار محلوں میں معاصی اور جرائم کا ارتکاب کر کے اپنی قوم کے لیے معاصی و جرائم کو خوشنما بنایا۔ انہی نے حرام کے مال کھا کر اپنی قوم کو حرام کھانے اور حرام کھلانے کی عادت ڈالی۔ انہی نے علم کو ضلالت کے لیے، عقل و فکر کو شرارت کے لیے، ذہانت کو مکر و فریب اور سازشوں کے لیے، دولت کو ایمان

لہ الانبیاء۔ ۷۳۔

خریدنے کے لیے، حکومت کو ظلم و جور کے لیے اور طاقت کو استکبار کے لیے استعمال کیا۔ پھر یہی ہیں جنہوں نے حقوق اور منافع تک پہنچنے اور ترقی کرنے کے اکثر جائز راستے بند کر دیتے اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ خوشامد، رشوت، جھوٹ، سازش اور ایسے ہی دوسرے ذلیل راستوں سے اپنے مقاصد کو پہنچیں۔ غرض اخلاق و اعمال کا کوئی فساد ایسا نہیں ہے جس کا آغاز ان مترفین سے نہ ہوا ہو۔ ان کو اللہ نے جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کو انہوں نے غلط طریقوں سے استعمال کیا۔ خود بھی بگڑے اور اپنے ساتھ قوم کو بھی بگاڑا ضَلُّوا وَأَضَلُّوا۔

یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا تھا اور اخلاقی فساد کا گھن مسلمانوں کی قومی طاقت کو اندر ہی اندر کھاتے جا رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود دلوں میں کم از کم ایمان کی روشنی موجود تھی۔ احکام خدا اور رسول کی پابندی چاہے نہ ہو مگر خدا اور رسول کی عظمت دلوں میں باقی تھی، قانونِ اسلام کی خلاف ورزی چاہے کتنی ہی کی گئی ہو مگر قانون کے احترام سے دل خالی نہ ہوتے تھے، اسلام کی حکومت سے انحراف خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو مگر اس کے مقابلہ میں بغاوت کی جرأت کبھی نہ ہوتی تھی۔ جس کو اسلام نے حق کہا تھا، اس کو حق ہی مانا جاتا تھا اگرچہ اس کو چھوڑ کر باطل کی پیروی میں کتنا ہی غلو کیوں نہ کیا گیا ہو۔ یہ جسارت کسی میں نہ تھی کہ اسلام کے بتاتے ہوئے حق کو باطل، باطل کو حق، فرض کو لغو و مہمل، جائز کو مکروہ، حرام کو حلال بلکہ مستحسن اور گناہ کو صواب کہا جاتا یا سمجھا جاتا۔ گناہوں کا ارتکاب بیشک ہوتا تھا۔ جرائم سے بلاشبہ دامن آلودہ ہوتے شریعت کی حدود سے بہت کچھ تجاوز کیا جاتا۔ قوانینِ اسلام کی خلاف ورزی حد سے گزر جاتی۔ مگر دل ان پر شرمسار بھی ہوتے تھے، ندامت سے گردنیں جھک بھی جاتی تھیں، کم از کم

دل اس کے معترف ہوتے تھے کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عقائد کی کمزوری اور اعمال کی خرابی کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب انہی قوائم و ارکان پر قائم تھی جو اسلام نے تعمیر کئے تھے۔ یونان و ایران کے افکار کی درآمد نے اگرچہ بہت کچھ گمراہی پھیلائی لیکن انہیں کبھی اتنی کامیابی نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے زاویہ نگاہ ہی کو پھیر دیتے، ان کی ذہنیت کے سانچے کو اسلام سے بالکل ہی منحرف کر دیتے، اور ان کی عقل و فکر و تمیز کی قوتوں کو یہاں تک متاثر کر دیتے کہ وہ مسلمان کی سی نظر سے دیکھنا اور مسلمان کے سے دماغ سے سوچنا بالکل چھوڑ ہی دیتے۔ اسی طرح تمدن و تہذیب کا ارتقاء اگرچہ بیرونی اثرات کے تحت اسلام کی متعین کی ہوئی راہوں سے بہت کچھ منحرف ہوا لیکن جن اصولوں پر اس تہذیب و تمدن کی بنا رکھی گئی تھی وہ بدستور اس کی بنیادیں موجود تھے، اور کسی دوسری مخالف تہذیب و تمدن کے اصولوں نے ان کی جگہ نہ لی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بہت کچھ بگڑا، مگر علوم دینی کو اس میں بہرحال ممتاز جگہ حاصل تھی اور کوئی تعلیم یافتہ مسلمان اسلامی عقائد اور احکام شریعت اور ملی روایات سے کم از کم ابتدائی علم سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی پر قانون اسلام کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہوئیں، مگر پھر بھی مسلمانوں کے جملہ معاملات پر ایک ہی قانون نافذ تھا، اور وہ اسلام کا قانون تھا۔ غرض تمام خرابیوں کے باوجود مسلمانوں کے تخیلات، اخلاق، اور اعمال پر اسلام کا ایک گہرا اثر تھا، اس کے اصولوں پر وہ یکسوئی کے ساتھ ایمان رکھتے تھے، کم از کم ان کے ایمان کی سرحد میں مخالفِ اسلام اصولوں کو داخل ہونے کا موقع نہ ملا تھا، اور اخلاق و اعمال کی جو قدریں (Values) اسلام نے متعین کی تھیں وہ اس حد تک متغیر نہ ہوئی تھیں کہ بالکل منقلب ہو جائیں

اور ان کے خلاف کچھ دوسری قدریں ان کی جگہ لے لیتیں۔

لیکن انیسویں صدی میں حکومت کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد جب ہماری قوم کے مترفین نے دیکھا کہ حکومت کے ساتھ جاہ و منزلت، عزت و حرمت، مال و منال سب ہی کچھ ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں اور غلامی کی حالت میں ان کو محفوظ رکھنے اور مافات کی تلافی کرنے کا کوئی ذریعہ بجز مغربی تہذیب اور علوم سے آراستہ ہونے کے نہیں ہے، تو ان کی روش میں ایک دوسرا تغیر ہوا جو صحیح معنوں میں محض تغیر ہی نہیں بلکہ ایک "انقلاب" تھا۔ تغیر کے معنی محض بدلنے کے ہیں، مگر انقلاب الٹ جانے کو کہتے ہیں۔ اور فی الواقع دوسری کروٹ میں وہ ایسے الٹ گئے کہ ان کا قبلۂ مقصود الٹ گیا، ان کی ذہنیت الٹ گئی، ان کی نظریں الٹ گئیں اور ان کا رخ اسلام سے فرنگیت کی طرف پھر گیا جو اسلام کے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ انقلاب جب شروع ہوا تو وہ شرمساری اور ندامت آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی جو قوانین اسلامی سے انحراف کرتے وقت پہلے محسوس کی جاتی تھی، بلکہ سرے سے یہ احساس ہی مٹنے لگا کہ شریعت کی حدود سے تجاوز کر کے وہ کسی گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شرمندگی و ندامت کی جگہ ڈھٹائی اور بے حیائی نے لے لی۔ علانیہ ہر قسم کی قانون شکنی کی جانے لگی اور شرم کے بجائے اس پر فخر کا اظہار ہونے لگا۔ مگر انقلاب کی رو اس حد پر بھی جا کر نہ رکی۔ اب جو باتیں فرنگیت مآب لوگوں کی مجلسوں میں سنی اور دیکھی جا رہی ہیں وہ بے حیائی سے گزر کر اسلام کے خلاف صریح بغاوت کے آثار ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک شخص جو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے الٹا

اس شخص کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پرانے قانون کی اب تک پابندی کیے جا رہا ہے۔ گویا اب مجرم اور گنہگار وہ نہیں ہے جو اسلامی قانون کو توڑتا ہے، بلکہ وہ ہے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ اب صرف نماز روزے سے پرہیز ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے، ترک صوم وصلوٰۃ کی تبلیغ کی جاتی ہے، روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ پابند صوم وصلوٰۃ لوگ (خصوصاً جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں) اپنے فعل پر اسلئے شرمندہ ہوں گے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز روزے کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی پابندی کرنا وہ عیب ہے جس پر کسی کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔ حد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو بڑے طنزیہ پیرایہ میں کہا جاتا ہے کہ آخر وہ حضرت نمازی ہیں نا، یعنی اس شخص سے عیب کے سرزد ہونے کا اصلی سبب کچھ اور نہیں بلکہ صرف وہ عمل ہے جس کو اللہ نے مانع فحشاء ومنکر قرار دیا ہے اور جسے رسول اللہ نے تمام اعمال سے افضل ٹھہرایا ہے۔

یہ بغاوت صرف نماز روزے تک محدود نہیں ہے، بلکہ قریب قریب زندگی کے تمام معاملات میں پھیل گئی ہے، اب اسلامی احکام کی پابندی کو "ملائیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور "ملائیت" ہمارے نئے زمانے کی اصطلاح میں تنگ نظری، تاریک خیالی، جہالت، دقیانوسیت اور بے عقلی کے سب سے زیادہ شدید مرکب کا نام ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ راسخ العقیدہ اور متبع شریعت مسلمان کا نام مُلّا ہے، اور مُلّا وہ ہے جو تہذیب اور روشن خیالی سے کوسوں دور ہو، جو مہذب سوسائٹی میں کسی طرح کھپ ہی نہ سکتا ہو، یہ سوگالیوں کی ایک گالی ہے، اور اظہار نفرت کے لیے بہت سے الفاظ بولنے کے بجائے ہمارے "کالے فرنگی" اپنے تمام جذبات کو سمیٹ کر صرف

ایک لفظ "مُلّا" میں بھر دیتے ہیں جو تمام عیوب کا جامع ہے۔

آج کسی قول یا فعل کی تائید میں یہ دلیل کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے۔ غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان جو بدقسمتی سے "تعلیم یافتہ اور روشن خیال" ہو گیا ہے، بلا تکلف قرآن و حدیث کی سند کو رد کر دیتا ہے اور اس پر ذرا نہیں شرماتا بلکہ توقع رکھتا ہے کہ اسلامی قانون کی سند لانے والے کو الٹا شرمندہ ہونا چاہیئے۔ قرآن و حدیث کا مستند ہونا تو درکنار ہم نے تو یہ حال دیکھا ہے کہ جس بات کو اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کے خلاف فوراً ایک تعصب سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی بات اگر عقلی استدلال کے ساتھ پیش کی جاتے، یا کسی مغربی مصنف کے حوالے سے بیان کی جاتے تو آمنا وصدقنا! لیکن اسلام کا نام آتے ہی ہمارے فرنگیت مآب مسلمانوں کے دماغوں میں اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اور انہیں شک ہو جاتا ہے کہ اس بات میں ضرور کوئی کمزوری ہو گی۔ گویا اب قرآن و حدیث کی سند ان لوگوں کی نظر میں کسی بات کو قوی نہیں کرتی بلکہ الٹا کمزور اور محتاجِ دلیل بنا دیتی ہے۔

چند سال پہلے یہ وبا صرف ہمارے مردوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور ہماری عورتیں اس سے محفوظ تھیں۔ کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ "حرم" وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے حجاب شرعی میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ تو نور ایمان سے منور رہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم از کم وہ گود تو کفر و ضلالت اور فسادِ اخلاق و اعمال سے

محفوظ رہے جس میں ایک بچہ پرورش پاتا ہے۔ کم ازکم اس گہوارے کے اردگرد تو خالص اسلامی فضا چھائی رہے جس میں مسلمان کی نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ کم ازکم وہ چار دیواری تو بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل ودماغ پر تعلیم وتربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ پس "حرم" دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے جس کو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو تو یہاں پناہ لے سکے۔ مگر افسوس کہ اب یہ قلعہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ فرنگیت کی وبا اب گھروں کے اندر بھی پہنچ رہی ہے۔ ہمارے فرنگیت مآب متفرنجین اب اپنی خواتین کو بھی کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں تاکہ وہ بھی انہی زہریلے اثرات سے متاثر ہوں جن سے وہ خود مسموم ہو چکے ہیں۔ ہماری قوم کی لڑکیاں اب ان تعلیم گاہوں میں گمراہی اور بداعتقادی اور فسادِ اخلاق اور فرنگی تہذیب کے سبق لینے کے لیے بھیجی جارہی ہیں جو اس سے پہلے ہمارے لڑکوں کو یہ سب کچھ سکھا کر اسلام سے باغی بنا چکی ہیں۔

یہ آخری حرکت ہمارے نزدیک اس انقلاب کی تکمیل کر دینے والی ہو گی جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ہمارا صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ تکمیل انقلاب کے آثار کو یہ بدنصیب آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ اور یہ بدقسمت کان سن چکے ہیں۔ اب یہ نوبت آ پہنچی ہے کہ ایک مسلمان عورت قرآن وحدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے، انگریزی ہوٹلوں میں جا کر لنچ اور ڈنر کھاتی ہے، سینما ہال میں جا کر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، بازاروں میں پھر کر شاپنگ کرتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے خلاف یہ تمام افعال کرنے پر شرمندہ

اور نادم ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کاموں کو بیان کرتی ہے اور الٹا اس بے چاری عفیفہ کو قابلِ ملامت ٹھیراتی ہے جس نے پہلے تو قانونِ اسلام کی پیروی میں حجابِ شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا، اور جب اس کا شوہر زبردستی باہر کھینچ ہی لایا تو اس کو مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماش بینی کرتے ہوئے شرم آئی، اور اسے بازاروں کے چکر لگانا، تاج اور گرین کے مزے چکھنا، سیرگاہوں کی ہوائیں کھانا اس چار دیواری کی بے لطفیوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں رہنے کا اس کے خدا اور اس کے رسول نے حکم دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گزر کر عورتوں تک میں بھی پہنچتی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس قابل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک مسلمان عورت اس پر شرمندہ و نادم ہو! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خدارا بتاؤ کہ پرانی دیندار خاتونوں کی گود میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوا ہے تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرتِ ایمانی سے بیگانہ اور اطاعتِ خدا و رسول کی حدود سے باہر ہو جائیں گی تو ان نسلوں کا کیا حشر ہوگا جو ان نئی فرنگیت مآب خواتین کی گودوں میں پرورش پا کر نکلیں گی! جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش فرنگیت ہی فرنگیت کے آثار دیکھیں گے، جن کی معصوم نگاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی علامت سے آشنا ہی نہ ہوں گی، جن کے کانوں میں کبھی خدا اور رسول کی باتیں پڑیں گی ہی نہیں، جن کے دل و دماغ کی لوحِ سادہ پر ابتدا ہی سے فرنگیت کے نقوش ثبت ہو جائیں گے، کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات، خیالات، اخلاق، اعمال، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے؟

جرم کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے مگر اس کو جرم سمجھے اور اس پر

شرمندہ ہو۔ اس قسم کا جرم محض اپنی حیثیت کے لحاظ سے سزا کا مستوجب ہوتا ہے بلکہ توبہ اور اظہارِ ندامت سے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا جرم صرف انسان کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔

جرم کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرلے اور اس کو عیب کے بجائے خوبی سمجھے اور فخر کے ساتھ اس کا علانیہ اظہار کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص کے دل میں اس قانون کا کوئی احترام نہیں ہے جو اس فعل کو جرم قرار دیتا ہے۔

جرم کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف ایک قانون کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے قانون کے لحاظ سے اس جرم کو جائز اور عین ثواب سمجھے، اور جو قانون اس فعل کو جرم ٹھہراتا ہے اس کا مذاق اڑاتے اور اس کی پیروی کرنے والوں کو خطاکار سمجھے، ایسا شخص صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہر شخص جس میں تھوڑی سی عقل سلیم بھی ہوگی، یہ تسلیم کرے گا کہ جب انسان اس آخری مرتبہ پر پہنچ جائے تو وہ اس قانون کی حدود میں نہیں رہ سکتا جس کے خلاف اس نے علانیہ بغاوت کی ہے۔ مگر کس قدر مردود ہے وہ شیطان جو تم کو یقین دلاتا ہے کہ تم اسلامی قانون کی تحقیر کرکے، اس کا مذاق اڑا کر، اس کی پیروی کو عیب ٹھہرا کر، اور اس کی خلاف ورزی کو ثواب قرار دے کر بھی مسلمان رہ سکتے ہو۔ ایک طرف تو تمہارا یہ حال ہے کہ خدا اور رسول جس کو اچھا کہیں اس کو تم برا کہو، وہ جس کو برا کہیں اس کو تم اچھا کہو، وہ جس کو گناہ ٹھہرائیں اس کو تم ثواب قرار دو، وہ جس کو ثواب ٹھہرائیں اس کو تم گناہ سمجھو، وہ جو حکم دیں اس کا تم مذاق اڑاؤ۔ وہ جو قانون بنائیں اس کی

خلاف ورزی پر شرمانے کے بجائے تم الٹا اس شخص کو شرمانے کی کوشش کرو جو ان کے قانون کی پیروی کرتا ہے۔ دوسری طرف تمہارا یہ دعویٰ کہ تم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی عظمت تمہارے دل میں ہے، اور ان کے پسندیدہ دین یعنی اسلام کے تم پیرو ہو۔ کیا کوئی صاحب عقل انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ اس طرز عمل کے ساتھ یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اگر ایمان کے ساتھ انکار جمع ہو سکتا ہے، اگر تعظیم کے ساتھ تحقیر جمع ہو سکتی ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ کسی کا احترام بھی دل میں ہو اور اس کا مذاق بھی اڑایا جائے، اگر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ خلاف ورزی پر فخر کرنے والا اور پیروی کو ملامت کے قابل سمجھنے والا بھی پیرو اور مطیع ہو، تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ بغاوت ہی عین اطاعت ہے، اور تحقیر ہی عین تعظیم ہے، اور انکار ہی کا نام ایمان ہے، جو تمہیں ٹھوکر مارتا ہے وہی دراصل تمہاری تعظیم کرتا ہے، جو تمہارا مذاق اڑاتا ہے وہی دراصل تمہارا احترام کرتا ہے، اور جو تمہیں جھوٹا کہتا ہے وہی دراصل تمہاری تصدیق کرنے والا ہے۔

اسلام بجز اطاعت کے اور کسی چیز کا نام نہیں ہے، اور حقیقی اطاعت ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتی اور ایمان کا اوّلین اقتضاء یہ ہے کہ آدمی کو جب خدا اور رسول کا حکم پہنچے تو اس کی گردن جھک جائے اور وہ اس کے مقابلے میں سر نہ اٹھا سکے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (النور۔ رکوع ۷)

مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

پھر یہ گردن جھکانا بھی بکراہت نہیں بطوع ورغبت ہونا چاہیئے، حتیٰ کہ حکم خدا و رسول کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی اور ناراضی چھپی ہوئی نہ ہو۔ جس شخص کی گردن محض ظاہر میں جھک جاتے مگر دل میں اس کے خلاف تنگی محسوس کر رہا ہو وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء۔ رکوع ۹۔ ۶۵)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمہاری طرف آتے ہوئے جی چراتے ہیں۔ پس قسم ہے تیرے پروردگار کی وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں، پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سر تسلیم خم کر دیں۔

لیکن جو شخص علانیہ حکم ماننے سے انکار کر دے اور خدا اور رسول کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی پیروی کرے اور انہی قوانین کو درست اور حق سمجھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے خدا اور رسول کے قانون کا مذاق اڑاتے اور اس کی اطاعت کو عیب ٹھہراتے وہ تو کسی طرح بھی مومن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور مسلمانوں کے سے نام سے موسوم ہو اور مردم شماری میں اس کو مسلمان لکھا گیا ہو۔ انسان گناہ کر کے مومن رہ سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس پر نادم ہو اور اس قانون کو تسلیم کرے جس کے خلاف محض اپنی فطری کمزوری سے اس نے ایک

فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن جب گناہ کے ساتھ بے شرمی اور ڈھٹائی بھی ہو، اور اس پر فخر بھی کیا جاتے، اور اس کو ثواب ٹھہرا کر اس شخص کو ملامت بھی کی جاتے جو اس کا ارتکاب نہیں کرتا، تو نفاق کی قسم ایسے گناہ کے ساتھ ایمان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی آدمی کو فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے یا اسلام سے نکل کر اس قانون کی اطاعت میں داخل ہو جانا پسند کرتا ہے جس کی پیروی میں اس کو شرح صدر حاصل ہو رہا ہے۔

خدا کے فضل سے ابھی تک مسلمانوں کے عوام اس فرنگیت اور ملحدانہ بغاوت کی رَو سے محفوظ ہیں۔ ابھی تک ان کے دلوں میں خدا اور رسول کے احکام کا احترام باقی ہے اور قوانینِ اسلامی کی پابندی تھوڑی بہت انہی میں نظر آتی ہے۔ لیکن خواص کی روش جس طرح پہلے ان کے اخلاق اور معاملات پر اثر انداز ہو چکی ہے اسی طرح اندیشہ ہے کہ نئی روش کہیں ان کے ایمان پر بھی رفتہ رفتہ اپنا مہلک اثر نہ ڈال دے۔ عامۂ مسلمین میں جس رفتار کے ساتھ ترکِ صوم و صلوٰۃ، مسکرات و منہیات کا ارتکاب، فرنگی اطوار کی تقلید کا شوق اور فرنگی تہذیب کو خوشنما بنا کر دکھانے والے کھیل تماشوں کی طرف میلان بڑھ رہا ہے وہ دراصل اس آنے والے خطرے کا الارم ہے۔ اگر ہمارے مترفین کے خیالات کی اصلاح نہ ہوئی اور اسلام کی صراطِ مستقیم سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ساری قوم اس ضلالت میں مبتلا ہو جائے گی اور اللہ کی یہ سنت پوری ہو کر رہے گی۔ اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۶)

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۱۳۵۳ھ۔ فروری ۱۹۳۵ء)

اجتماعی فساد

قرآن مجید میں ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کہ کسی قوم کو خواہ مخواہ برباد کر دے دراں حالیکہ وہ نیکوکار ہو۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (ہود-۱۰)

اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کرے حالانکہ اسکے باشندے نیک عمل کرنیوالے ہوں۔

ہلاک و برباد کر دینے سے مراد صرف یہی نہیں کہ بستیوں کے طبقے الٹ دیئے جائیں اور آبادیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے، ان کی اجتماعی قوت توڑ دی جائے، ان کو محکوم و مغلوب اور ذلیل و خوار کر دیا جائے۔ قاعدۂ مذکور کی بنا پر بربادی اور ہلاکت کی جملہ اقسام میں سے کوئی قسم بھی کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خیر و صلاح کے راستے کو چھوڑ کر شر و فساد اور سرکشی و نافرمانی کے طریقوں پر نہ چلنے لگے اور اس طرح خود اپنے اوپر ظلم نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر جہاں کہیں کسی قوم کو مبتلائے عذاب کرنے کا ذکر فرمایا ہے، وہاں اس کا جرم بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی اپنی ہی شامتِ اعمال ہے جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کرتی ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (العنکبوت۔ ۴۰)

ہر ایک کو ہم نے اس کے قصور ہی پر پکڑا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

دوسری بات جو اس قاعدے سے نکلتی ہے، یہ ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے۔ یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں تو خواہ افراد علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں، قوم بحیثیت مجموعی سنبھلی رہتی ہے اور کوئی فتنہ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو۔ مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گزر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملنے لگے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ایسی قوم سے پھر جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک اٹھتا ہے، اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی بکثرت مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

قوم نوح کو اس وقت برباد کیا گیا جب اعتقاد و عمل کی خرابیاں ان کے اندر جڑ پکڑ گئیں اور زمین میں پھیلنے لگیں، اور یہ امید ہی باقی نہ رہی کہ اس شجر خبیث سے کبھی کوئی اچھا پھل بھی پیدا ہوگا۔ آخر کار مجبور ہو کر حضرت نوح نے بارگاہ رب العزت

میں عرض کیا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ، اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح-۲۶)

میرے پروردگار زمین پر ان کافروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر پیدا ہوگا۔

قوم عاد کو اس وقت تباہ کیا گیا جب شر اور فساد نے ان کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا کہ شریر اور مفسد اور ظالم ان کی قوم کے لیڈر اور حاکم بن گئے۔ اور اہل خیر و صلاح کے لیے نظام اجتماعی میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ہود-۵۹)

اور یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار دشمن حق کا اتباع کیا۔

قوم لوط کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب ان کا اخلاقی شعور اتنا کند ہو گیا اور ان میں بے حیائی یہاں تک بڑھ گئی کہ علانیہ مجلسوں اور بازاروں میں فواحش کا ارتکاب کیا جانے لگا، اور فواحش کے فواحش ہونے کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (عنکبوت-۲۹)

(لوط نے کہا) کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستوں میں لوگوں کو چھیڑتے اور ستاتے ہو اور اپنی محفلوں میں بدکاریاں کرتے ہو۔

یہاں میں پر اس وقت عذاب نازل ہوا جب پوری قوم خائن اور بد معاملہ اور بے ایمان ہو گئی۔ کم تولنا اور زیادہ لینا کوئی عیب نہ رہا اور قوم کا اخلاقی احساس یہاں تک فنا ہو گیا کہ جب ان کو اس عیب پر ملامت کی جاتی تو شرم سے سر جھکا لینے کے بجائے وہ الٹا اس ملامت کرنے والے کو ملامت کرتے، اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں کوئی ایسا عیب بھی ہے جو ملامت کے قابل ہو۔ وہ بدکاریوں کو برا نہ سمجھتے بلکہ جو ان حرکات کو برا کہتا اسی کو بر سر غلط اور لائق سرزنش خیال کرتے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا، وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (ہود۔ ۸۵-۹۱)

(شعیب نے کہا) اور اے میری قوم کے لوگو، انصاف کیساتھ ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب تو جو باتیں کہتا ہے ان میں سے تو اکثر ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ اور ہم تو تجھے اپنی قوم میں کمزور پاتے ہیں اور اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔

بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنت الٰہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ اسوقت صادر ہوا جب انہوں نے بدی اور ظلم اور حرام خوری کی طرف لپکنا شروع کیا، ان کی قوم کے پیشوا مصلحت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، ان میں گناہوں کے ساتھ رواداری پیدا ہو گئی، اور ان میں کوئی گروہ ایسا نہ رہا جو عیب کو عیب کہنے والا اور اس سے روکنے والا ہوتا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ - ۶۲ - ۶۳)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدود الٰہی سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ کیسی بری حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے۔ کیوں نہ ان کے مشائخ اور علما نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (المائدہ ۷۹)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی اس لیے کہ انھوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن کریم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا۔

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی یا دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور

یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت
کرنے سے نہ روکتا۔ جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا
اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد اور
عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔"
راوی کہتا ہے کہ جب حضورؐ سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں اٹھ
بیٹھے اور فرمایا:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم پر لازم ہے
کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو برا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو
اور اسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو
ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اسی
طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

اعتقاد اور عمل کے فساد کا حال وبائی امراض کا سا ہے۔ ایک وبائی مرض ابتدا میں چند
کمزور افراد پر حملہ کرتا ہے۔ اگر آب و ہوا اچھی ہو، حفظانِ صحت کی تدابیر درست ہوں،
نجاستوں اور کثافتوں کو دور کرنے کا کافی انتظام ہو، اور مرض سے متاثر ہونے والے
مریضوں کا بر وقت علاج کر دیا جائے تو مرض وبائے عام کی صورت اختیار کرنے نہیں
پاتا اور عام لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن اگر طبیب غافل ہو، حفظان صحت
کا محکمہ بے پروا ہو۔ صفائی کے منتظم نجاستوں اور کثافتوں کے روادار ہو جائیں، تو رفتہ رفتہ
مرض کے جراثیم فضا میں پھیلنے لگتے ہیں اور آب و ہوا میں سرایت کر کے اس کو اتنا خراب
کر دیتے ہیں کہ وہ صحت کے بجائے مرض کے لیے سازگار ہو جاتی ہے۔ آخر کار

جب بستی کے عام افراد کو ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان غرض کوئی چیز بھی گندگی اور سمیت سے پاک نہیں ملتی تو ان کی قوتِ حیات جواب دینے لگتی ہے اور ساری کی ساری آبادی وبائے عام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر قوی سے قوی افراد کے لیے بھی اپنے آپ کو مرض سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود طبیب اور صفائی کے منتظم اور صحت عامہ کے محافظ تک بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے جو اپنی حد تک حفظانِ صحت کی جملہ تدبیریں اختیار کرتے اور دوائیں استعمال کرتے رہتے ہیں کیونکہ ہوا کی سمیت، پانی کی گندگی، وسائلِ غذا کی خرابی، اور زمین کی کثافت کا ان کے پاس کیا علاج ہو سکتا ہے۔

اسی پر اخلاق و اعمال کے فساد اور اعتقاد کی گمراہیوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ علماء قوم کے طبیب ہیں۔ حکام اور اہلِ دولت، صفائی اور حفظانِ صحت کے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی غیرتِ ایمانی اور جماعت کا حاسۂ اخلاقی بمنزلۂ قوتِ حیات (Vitality) ہے۔ اجتماعی ماحول کی حیثیت وہی ہے جو ہوا، پانی، غذا اور لباس و مکان کی ہے۔ اور حیاتِ قومی میں دینی و اخلاقی کے اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہی مقام ہے جو صحتِ جسمانی کے اعتبار سے صفائی و حفظانِ صحت کی تدابیر کا ہے۔ جب علماء اور اولی الامر اپنے اصلی فرض یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں اور شر و فساد کے ساتھ رواداری برتنے لگتے ہیں تو گمراہی اور بد اخلاقی قوم کے افراد میں پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور قوم کی غیرتِ ایمانی ضعیف ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا اجتماعی ماحول فاسد ہو جاتا ہے، قومی زندگی کی فضا خیر و صلاح کے لیے ناسازگار اور شر و فساد کے لیے سازگار ہو جاتی ہے، لوگ نیکی سے بھاگتے ہیں اور بدی سے نفرت کرنے

سے بچانے اس کی طرف کھینچنے لگتے ہیں، اخلاقی قدریں الٹ جاتی ہیں، عیب ہنر بن جاتے ہیں اور ہنر عیب۔ اس وقت گمراہیاں اور بداخلاقیاں خوب پھلتی پھولتی ہیں اور بھلائی کا کوئی بیج برگ وبار لانے کے قابل نہیں رہتا۔ زمین، ہوا اور پانی سب اس کو پرورش کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی ساری قوتیں اشجار خبیثہ کو نشو ونما دینے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو جاتا ہے تو پھر وہ عذاب الہٰی کی مستحق ہو جاتی ہے اور اس پر ایسی عام تباہی نازل ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچتا خواہ وہ خانقاہوں میں بیٹھا ہوا رات دن عبادت کر رہا ہو۔

اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (انفال ۲۵)

بچو اس فتنہ سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کریگا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھہرنے دو، کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری برتو گے اور اس کو پھیلنے دو گے تو اللہ کی طرف سے عذاب عام نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور بُرے سب آجائیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ:۔

ان اللہ لا یعذب العامة بعمل خاص حتی یروا المنکر بین ظهرانیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکروه فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ الخاصة والعامة۔

اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا مگر جب وہ اپنے سامنے

بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ
خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ہر فرد میں غیرتِ ایمانی اور حاسۂ اخلاقی موجود ہو جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع لفظ "حیا" سے تعبیر فرمایا ہے۔ حیا دراصل ایمان کا ایک جز ہے۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے :۔ الحیاء من الایمان۔ بلکہ ایک موقع پر جب حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ حیا دین کا ایک جز ہے۔ تو آپ نے فرمایا بل ھو لدین کلہ یعنی وہ پورا ایمان ہے۔

حیا سے مراد یہ ہے کہ بدی اور معصیت سے نفس میں طبیعی طور پر انقباض پیدا ہو اور دل اس سے نفرت کرے جس شخص میں یہ صفت موجود ہو گی وہ نہ صرف قبائح سے اجتناب کرے گا بلکہ دوسروں میں بھی اس کو برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ برائیوں کو دیکھنے کا روادار نہ ہو گا۔ ظلم اور معصیت سے مصالحت کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ جب اس کے سامنے قبائح کا ارتکاب کیا جائے گا تو اس کی غیرتِ ایمانی جوش میں آجائے گی اور وہ اس کو ہاتھ سے یا زبان سے مٹانے کی کوشش کرے گا یا کم از کم اس کا دل اس خواہش سے بے چین ہو جائے گا کہ اس برائی کو مٹادے۔

من رأى منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ
فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان

تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹادے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو دل سے اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔

جس قوم کے افراد میں عام طور پر یہ صفت موجود ہو گی اس کا دین محفوظ رہے گا

اور اس کا اخلاقی معیار کبھی نہ گر سکے گا، کیونکہ اس کا ہر فرد دوسرے کے لیے محتسب اور نگراں ہوگا اور عقیدہ و عمل کے فساد کو اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راہ نہ مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصد دراصل ایسی ہی ایک آئیڈیل سوسائٹی بنانا ہے جس کا ہر فرد اپنے قلبی رجحان اور اپنی فطرت غیرت و حیا اور خالص اپنے ضمیر کی تحریک پر احتساب اور نگرانی کا فرض انجام دے اور کسی اجرت کے بغیر خدائی فوجدار بن کر رہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ-۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر نگراں رہو اور رسول تم پر نگراں رہے۔

اسی لیے بار بار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا تمہارا قومی خاصہ ہے جو ہر مومن مرد اور عورت میں متحقق ہونا چاہیے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران-۱۱۰)

تم بہترین قوم ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ-۷۱)

مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں نیکی کا حکم کرتے اور بدی سے روکتے ہیں۔

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (توبہ - ۱۱۲)

وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور حدود الہٰی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج - ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں حکومت بخشیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ان کی مثال اس بستی کی سی ہوگی جس کے ہر باشندے میں صفائی اور حفظانِ صحت کا احساس ہو۔ وہ نہ صرف اپنے جسم اور اپنے گھر کو پاک صاف رکھے، بلکہ بستی میں جہاں کہیں غلاظت اور نجاست دیکھے اس کو دور کر دے، اور کسی جگہ گندگی و کثافت کے رہنے کا روادار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی بستی کی آب و ہوا پاک صاف رہے گی۔ اس میں امراض کے جراثیم پرورش نہ پا سکیں گے اور اگر شاذ و نادر کوئی شخص کمزور اور مریض الطبع ہوگا بھی تو اس کا بروقت علاج ہو جائے گا، یا کم از کم اس کی بیماری محض شخصی بیماری ہوگی، دوسروں تک متعدی ہو کر وبائے عام کی صورت نہ اختیار کر سکے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قوم اس بلند درجہ پر نہ رہ سکے تو سوسائٹی کی دینی و اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم ایک ایسا گروہ تو ان میں ضرور موجود رہنا چاہیے جو ہر وقت اس خدمت پر مستعد رہے اور اعتقاد کی گندگیوں اور اخلاق و اعمال کی نجاستوں

کو دور کرتا رہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴)

تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلانے والی ہو، نیکی کا حکم دے

اور بدی سے روکے۔

یہ جماعت علماء اور اولوالامر کی جماعت ہے جس کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں منہمک رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا شہر کے محکمہ صفائی وحفظانِ صحت کا اپنے فرائض میں مستعد رہنا ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے فرض سے غافل ہو جائیں اور قوم میں ایک جماعت بھی ایسی باقی نہ رہے جو خیر وصلاح کی طرف دعوت دینے والی اور منکرات سے روکنے والی ہو تو دین واخلاق کے اعتبار سے قوم کی تباہی اسی طرح یقینی ہے جس طرح جسم وجان کے اعتبار سے اس بستی کی ہلاکت یقینی ہے جس میں صفائی وحفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگلی قوموں پر جو تباہیاں نازل ہوئی ہیں وہ اسی لیے ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی گروہ بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جو ان کو برائیوں سے روکتا اور خیر وصلاح پر قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ (ہود ۱۱۶)

تم سے پہلی قوموں میں کہ ایسے اہل فضل ہی کیوں نہ ہوتے جو زمین میں فساد سے

روکنے والے ہوتے، بجز چند آدمیوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا کر نکال دیا۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ

السُّحْتَ (المائدہ ۶۳)

کیوں نہ ان کے علما۔ اور مشائخ نے ان کو بُری باتیں کہنے اور حرام خوری کرنے سے باز رکھا؟

پس قوم کے علما۔ و مشائخ اور اولوالامر کی ذمہ داری سب سے بڑی ذمہ داری ہے وہ صرف اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں بلکہ پوری قوم کے اعمال کی جوابدہی بھی ایک بڑی حد تک ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظالم جفاکار اور عیش پسند امرا۔ اور ایسے امرا۔ کی خوشامدیں کرنے والے علما۔ و مشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے، ان کا جو کچھ حشر خدا کے ہاں ہوگا اس کے ذکر کی حاجت نہیں۔ لیکن جو امرا۔ اور علما۔ و مشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوتے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں وہ بھی خدا کے ہاں جواب دہی سے نہیں بچ سکتے کیونکہ جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گمراہی اور بد اخلاقی کے طوفان امڈے چلے آ رہے ہوں۔ تو ان کا کام یہ نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکاتے بیٹھے رہیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مرد میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لا کر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کرنے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں، مگر اس کے مقابلہ میں اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے۔ اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یوم الفصل کی جواب دہی سے بری نہ کر دے گی۔ آپ محکمہ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہو، اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں، مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور

اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدبیر کر رہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابل اعتراض نہیں لیکن محکمہ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ۔ مارچ ۱۹۳۵ء)

ایمان اور اطاعت

اجتماعی نظم خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو اور کسی غرض و غایت کے لیے ہو، اپنے قیام و استحکام اور اپنی کامیابی کے لیے دو چیزوں کا ہمیشہ محتاج ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جن اصولوں پر کسی جماعت کی تنظیم کی گئی ہو وہ اس پوری جماعت اور اس کے ہر فرد کے دل و دماغ میں خوب بیٹھے ہوئے ہوں اور جماعت کا ہر فرد ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ جماعت میں سمع و اطاعت کا مادہ موجود ہو، یعنی اس نے جس کسی کو اپنا صاحب امر تسلیم کیا ہو، اس کے احکام کی پوری طرح اطاعت کرے، اس کے مقرر کیے ہوئے ضوابط کی سختی کے ساتھ پابند رہے، اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یہ ہر نظام کی کامیابی کے لیے ناگزیر شرطیں ہیں۔ کوئی نظام خواہ وہ نظام عسکری ہو، یا نظام سیاسی، یا نظام عمرانی، یا نظام دینی، ان دونوں شرطوں کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کوئی تحریک متزلزل، منافق، نافرمان اور غیر مطیع پیرووں کے ساتھ کامیاب ہوئی ہو، یا بدرجۂ آخر چل سکی ہو۔ تاریخ کے صفحات میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے گرد و پیش کی دنیا ہی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آپ اس فوج کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جو اپنی سلطنت کی وفادار اور اپنے سالارِ لشکر کی مطیع فرمان نہ رہے، جس

کے سپاہی فوجی ضوابط کی پابندی سے انکار کریں، پریڈ کا بگل بجے تو کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ کمانڈر کوئی حکم دے تو سپاہی سنی ان سنی کر جائیں! کیا آپ سپاہیوں کے ایسے انبوہ کو فوج کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ اُمید کر سکتے ہیں کہ ایسی بن سری فوج کسی جنگ میں کامیاب ہوگی؟ آپ اس سلطنت کے متعلق کیا کہتے ہیں جس کی رعایا میں قانون کا احترام باقی نہ رہے، جس کے قوانین علی الاعلان توڑے جائیں، جس کے محکموں میں کسی قسم کا ضبط و نظم باقی نہ رہے، جس کے کارکن اپنے مقتدر اعلیٰ کے احکام بجالانا چھوڑ دیں۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی رعایا اور ایسے عمال کے ساتھ کوئی سلطنت دنیا میں قائم رہ سکتی ہے؟ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان طاقت حاصل کی ہے تمام دنیا اس کی معترف ہے۔ مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟ وہی دو، یعنی ایمان اور اطاعت۔ نازی اور فاشسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقت ور اور اتنی کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔

یہ قاعدہ کلیہ ایسا ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔ ایمان اور اطاعت دراصل نظم کی جان ہے۔ ایمان جتنا راسخ ہوگا اور اطاعت جتنی کامل ہوگی، نظم اتنا ہی مضبوط اور طاقت ور ہوگا اور اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ بخلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت سے جتنا انحراف ہوگا اسی قدر نظم کمزور ہوگا اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی جماعت میں نفاق، بدعقیدگی، انتشار خیال، خودسری، نافرمانی اور بےضابطگی

کے امراض پھیل جائیں اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے اور وہ کسی شعبۂ حیات میں ترقی کی طرف رواں دواں نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ دنیا جب سے آباد ہوئی ہے اس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا اور اگر قانونِ فطرت اٹل ہے تو اس قانون کی یہ دفعہ بھی اٹل ہے کہ دونوں حالتیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔

اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالیے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعقیدگی کی کونسی قسم ایسی ہے جس کا انسان تصور کر سکتا ہو اور وہ مسلمانوں میں موجود نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے نظام میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں اور اب تک جاہلیت کے عقائد پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلام کے اساسی اصولوں میں شک رکھتے ہیں اور شکوک کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو علانیہ مذہب اور مذہبیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کی تعلیمات کے مقابلہ میں کفار سے حاصل کیے ہوئے تخیلات و افکار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے قوانین پر جاہلیت کے رسوم یا کفار کے قوانین کو مقدم رکھتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے دشمنوں کو خوش کرنے کے لیے شعائرِ اسلامی کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کی خاطر اسلام کے مصالح کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا ساتھ دیتے ہیں، اسلامی اغراض کے خلاف کفار کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ان کو اتنا بھی عزیز نہیں کہ اس کی خاطر وہ ایک بال برابر بھی نقصان گوارا کر سکیں۔ راسخ الایمان

اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک نہایت قلیل جماعت کو چھوڑ کر اس قوم کی بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے منافق اور فاسد العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔

یہ تو تھا ایمان کا حال۔ اب سمع و طاعت کا حال دیکھیے۔ آپ مسلمانوں کی کسی بستی میں چلے جائیے آپ کو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ اذان ہوتی ہے مگر بہت سے مسلمان یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ موذن کس کو بلا رہا ہے اور کس چیز کے لیے بلا رہا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی مسلمان اپنے کاروبار یا لہو ولعب کو یادِ خدا کے لیے نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا زمانہ آتا ہے تو بعض مسلمانوں کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہت سے مسلمان علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے روزہ نہ رکھنے پر ذرہ برابر نہیں شرماتے، بلکہ بس چلتا ہے تو الٹا روزہ رکھنے والوں کو شرم دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ روزہ رکھتے بھی ہیں ان میں سے بھی بہت کم ہیں جو احساسِ فرض کے ساتھ ایسا کرتے ہیں، ورنہ کوئی محض رسم ادا کرتا ہے، کوئی صحت کے لیے مفید سمجھ کر رکھ لیتا ہے اور کوئی روزہ رکھ کر وہ سب کچھ کرتا ہے جس سے خدا اور اس کے رسول نے منع کیا ہے۔ زکوٰۃ اور حج کی پابندی اس سے بھی کم تر ہے۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کا امتیاز تو مسلمانوں میں سے اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جس کو خدا اور رسول نے منع کیا ہو اور مسلمان اس کو اپنے لیے مباح نہ کر لیتے ہوں۔ وہ کونسی حد ہے جو خدا اور رسول نے مقرر کی ہو اور مسلمان اس سے تجاوز نہ کرتے ہوں۔ وہ کونسا ضابطہ ہے جو خدا اور رسول نے قائم کیا ہو اور مسلمان اس کو نہ توڑتے ہوں۔ اگر مردم شماری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان کروڑوں ہیں مگر ان کروڑوں میں دیکھیے کہ کتنے

فی صدی نہیں، کتنے فی ہزار بلکہ کتنے فی لاکھ خدا اور رسول کے احکام کو ماننے والے ٹھیک ٹھیک اسلامی ضوابط کی پابندی کرنے والے ہیں۔

جس قوم میں منافقت اور ضعفِ اعتقاد کا مرض عام ہوجائے، جس قوم میں فرض کا احساس باقی نہ رہے، جس قوم سے سمع و طاعت اور ضابطہ کی پابندی اٹھ جائے، اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہیئے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں۔ جہاں ان کی اپنی حکومت موجود ہے، وہاں بھی وہ غیروں کے اخلاقی، ذہنی اور مادی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت، مفلسی اور خستہ حالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی پستی نے ان کو صد درجہ ذلیل کر دیا ہے امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لیے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے، اب ان سے دوسروں کی طرف منتقل ہو چکی ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، جھوٹ، دغا اور بد معاملگی نے لے لی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور پاکیزگی اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں۔ جماعتی غیرت و حمیت روز بروز ان سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹے چلے جاتے ہیں اور کسی مشترک غرض کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہوگئے ہیں۔ قوموں کا اعتماد ان پر سے اٹھ گیا ہے اور اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی قومی اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی قومی تہذیب و شائستگی فنا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اپنے حقوق کی مدافعت اور اپنے شرفِ قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم ان میں بڑھ رہی ہے، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات

کا اضافہ ہو رہا ہے۔ بنگلوں میں رہنے والے، موٹروں پر چڑھنے والے، سوٹ پہننے والے، بڑے بڑے ناموں سے یاد کیے جانے والے، بڑی سرکاروں میں سرفرازیاں پانے والے ان میں روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے وہ پہلے متصف تھے اب ان سے عاری ہیں، اپنی ہمسایہ قوموں پر ان کی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے۔ جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے، جو اجتماعی قوت و طاقت ان سے پہلے تھی وہ اب نہیں ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ خراب آثار نظر آ رہے ہیں۔

کوئی مذہب ہو یا تہذیب یا کسی قسم کا نظامِ جماعت ہو، اس کے متعلق دو ہی طرزِ عمل انسان کے لیے معقول ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے قانون و ضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے، اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں داخل نہ ہو یا ہو چکا ہے تو علانیہ اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرزِ عمل نہیں ہو سکتا کہ تم ایک نظام میں شریک بھی ہو، اس کے ایک جزو بن کر بھی رہو، اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ بھی کرو اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے کلاً یا جزاً انحراف بھی کرو، اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو، اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کر لو۔ اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں، خلوصِ نیت سے تمہارے دل خالی ہو جائیں تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخِ عزم نہ پیدا ہو سکے، فرض شناسی، اتباعِ قانون اور باضابطگی

کے اوصاف سے تم عاری ہو جاؤ، اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظام جماعت کے کارآمد رکن بن سکو۔ ان کمزوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہو گے اس کے لیے لعنت بن جاؤ گے۔ جس نظام میں بھی داخل ہو گے اسے درہم برہم کردو گے۔ جس تہذیب کے جسم میں داخل ہو گے اس کے لیے جذام کے جراثیم ثابت ہو گے جس مذہب کے پیرو بنو گے اس کو مسخ کر کے چھوڑو گے۔ ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری طرح پیروی کرسکو اسی میں جا شامل ہو۔ منافق مسلمان سے تو وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اس کے ضوابط کی پابندی کریں۔

جو لوگ مسلمانوں کے مرض کا علاج تعلیم مغربی اور تہذیب جدید اور اقتصادی حالات کی اصلاح اور سیاسی حقوق کے حصول کو سمجھتے تھے وہ غلطی پر تھے، اور اب بھی جو ایسا سمجھ رہے ہیں وہ غلطی کر رہے ہیں۔ بخدا اگر مسلمانوں کا ہر فرد ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی اور بیرسٹر ہو جائے، دولت و ثروت سے مالا مال ہو، مغربی فیشن سے از سر تا قدم آراستہ ہو، اور حکومت کے تمام عہدے اور کونسلوں کی تمام نشستیں مسلمانوں ہی کو مل جائیں، مگر ان کے دل میں نفاق کا مرض ہو، وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں، وہ نافرمانی سرکشی اور بے ضابطگی کے خوگر ہوں، تو اسی پستی اور ذلت اور کمزوری میں اس وقت بھی مبتلا رہیں گے جس میں آج مبتلا ہیں۔ تعلیم، فیشن، دولت اور حکومت، کوئی چیز ان کو اس گڑھے سے نہیں نکال سکتی جس میں وہ اپنی سیرت اور اپنے اخلاق کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ اگر ترقی کرنی ہے اور ایک طاقتور با عزت جماعت بننا ہے تو سب

سے پہلے مسلمانوں میں ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف پیدا کرو کہ اس کے
بغیر نہ تمہارے افراد میں کس بل پیدا ہو سکتا ہے، نہ تمہاری جماعت میں نظم پیدا ہو
سکتا ہے، اور نہ تمہاری اجتماعی قوت اتنی زبردست ہو سکتی ہے کہ تم دنیا میں سربلند
ہو سکو۔ ایک منتشر جماعت جس کے افراد کی اخلاقی اور معنوی حالت خراب ہو، کبھی
اس قابل نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی منظم اور مضبوط قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے۔ بھوس
کے پولوں کا انبار خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کبھی قلعہ نہیں بن سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن وہ ہیں جو مسلمانوں میں بدعقیدگی اور نافرمانی
پھیلا رہے ہیں۔ یہ منافقوں کی سب سے زیادہ بری قسم ہے جس کا وجود مسلمانوں
کے لیے حربی کافروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ باہر سے حملہ نہیں کرتے
بلکہ گھر میں بیٹھ کر اندر ہی اندر ڈائنا مائٹ بچھاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دین اور دنیا
دونوں میں رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا
گیا ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی طرح کافر بنانا چاہتے ہیں جس طرح وہ خود ہو گئے ہیں۔
وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَآءً ان کے شر سے بچنے کی کم سے کم
تدبیر یہ ہے کہ جو لوگ دل سے مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ ان سے
قطع تعلق کر لیں فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ۔ ورنہ قرآن نے تو ان کی آخری سزا یہ
قرار دی ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ
حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (النساء۔ ۸۹)

(ترجمان القرآن۔ رمضان ۵۳ھ۔ دسمبر ۱۹۳۴ء)

مسلمان کا حقیقی مفہوم

ہماری روزمرہ کی بول چال میں بعض ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہیں جن کو بولتا تو ہر شخص ہے، مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔ کثرتِ استعمال نے ان کا ایک اجمالی مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے۔ بولنے والا جب ان الفاظ کو زبان سے نکالتا ہے تو وہی مفہوم مراد لیتا ہے۔ اور سننے والا جب انہیں سنتا ہے تو اسی مفہوم کو سمجھتا ہے۔ لیکن وہ گہرے معانی جن کے لیے واضع نے ان الفاظ کو وضع کیا تھا، جہلا تو درکنار اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر "اسلام" اور "مسلمان" کو لیجیے۔ کس قدر کثرت سے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں اور کتنی ہمہ گیری کے ساتھ انہوں نے ہماری زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے! مگر کتنے بولنے والے ہیں جو ان کو سوچ سمجھ کر بولتے ہیں؟ اور کتنے سننے والے ہیں جو انہیں سن کر وہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کے لیے یہ الفاظ وضع کیے گئے تھے؟ غیر مسلموں کو جانے دیجیے۔ خود مسلمانوں میں ۹۹ فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "مسلمان" کہتے اور اپنے مذہب کو اسلام کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، مگر نہیں جانتے کہ "مسلمان" ہونے کے معنی کیا ہیں اور لفظ "اسلام" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ آیئے آج تھوڑا سا وقت ہم انہی الفاظ کی تشریح میں صرف کریں۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اگر آپ لوگوں کے احوال پر نگاہ ڈالیں گے تو

عموماً تین قسم کے لوگ آپ کو ملیں گے۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو علانیہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کے قائل ہیں۔ ہر معاملہ میں خود اپنی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ صرف اپنی عقل کے فیصلوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے اپنے خیال میں صحیح ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی پیروی سے ان کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بظاہر کسی مذہب کو مانتے ہیں مگر حقیقت میں پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد اور قوانین عمل کے لیے مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ خود اپنی طبیعت کے رجحان یا دلچسپی یا اغراض وحاجات کے لحاظ سے کچھ عقائد اپنے ذہن میں جما لیتے ہیں، عمل کے کچھ طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو ان کے مطابق ڈھال لیں، گویا در حقیقت وہ مذہب کے پیرو نہیں ہوتے بلکہ مذہب ان کا پیرو ہوتا ہے۔

تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو معطل رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرنے لگتے ہیں خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں، یا ان کے ہم عصر۔

پہلا گروہ آزادی کے نام پر مرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کے صحیح حدود کیا ہیں؟ فکر وعمل کی آزادی بلاشبہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو گمراہی بن جاتی ہے۔ جو شخص ہر معاملہ میں صرف اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے، ہر مسئلے میں صرف اپنی عقل کو حکم مانتا ہے، وہ دراصل اس غلط فہمی

میں مبتلا ہے کہ اس کے علم اور اس کی عقل نے دنیا بھر کے تمام امور کا احاطہ کر لیا ہے۔ کوئی حقیقت اور مصلحت اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر منزل کی راہ ورسم سے وہ باخبر ہے۔ ہر مسلک کی پیچیدگیوں کا اسے علم ہے ہر رستے کی انتہا کو بھی وہ اسی طرح جانتا ہے جس طرح اس کی ابتدا کو۔ یہ علم اور ہوشمندی کا زعم درحقیقت ایک زعم باطل ہے اور اگر انسان صحیح معنوں میں خود اپنی عقل کو حکم بنائے تو خود عقل ہی یہ کہہ دے گی کہ میرا اندھا مقلد مجھ کو جن صفات سے متصف سمجھتا ہے، حقیقۃً میں ان سے متصف نہیں ہوں۔ مجھ کو اپنا واحد رہنما سمجھنے والا صرف میری رہنمائی میں زندگی کی راہ طے کرنے والا ٹھوکروں، لغزشوں، گمراہیوں اور ہلاکتوں سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی حریتِ فکر و عمل، تمدن و تہذیب کے لیے بھی مہلک ہے۔ حریت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر شخص وہی اعتقاد رکھے جو خود اس کے اپنے خیال میں صحیح ہو اور اسی راہ پر چلے جو اس کی اپنی عقل کے مطابق درست ہو۔ تمدن و تہذیب کا اقتضا یہ ہے کہ ایک نظامِ تمدن میں جتنے لوگ ہیں وہ سب چند بنیادی عقائد و افکار میں متفق ہوں اور اپنی عملی زندگی میں ان مخصوص اطوار و آداب اور قوانین کی پیروی کریں جو حیاتِ اجتماعی کی تنظیم کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ پس حریتِ فکر و عمل اور تمدن و تہذیب میں کھلی ہوئی منافات ہے۔ حریت، افراد میں خود سری، بے قیدی اور آزادی پیدا کرتی ہے۔ تمدن ان سے اتباع، پیروی اور تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جہاں کامل حریت ہوگی وہاں تمدن نہ ہوگا۔ اور جہاں تمدن ہوگا وہاں افراد کو ایک بڑی حد تک حریتِ فکر و عمل سے دست کش ہونا پڑے گا۔

دوسرے گروہ کا حال پہلے گروہ سے زیادہ بُرا ہے۔ پہلا گروہ صرف گمراہ ہے۔ دوسرا گروہ اس کے ساتھ جھوٹا، منافق، دھوکہ باز اور بدطینت بھی ہے۔ اگر تاویل کے جائز حدود میں رہ کر ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے تخیلات ورجحانات میں موافقت پیدا کرسکتا ہو تو حریت فکر وعمل کے ساتھ مذہب کا اتباع ممکن ہے۔ اگر انسان کے اپنے رجحانات مذہب کے خلاف ہوں اور اس کے باوجود وہ مذہب کو صحیح اور اپنے رجحانات کو غلط سمجھتا ہو، تب بھی ایک حد تک اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ وہ واقعی اس مذہب کو مانتا ہے جس کی پیروی کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن اگر مذہب کی واضح تعلیمات سے اس کے عقائد اور اعمال صریحاً مختلف ہوں اور وہ اپنے خیالات کو صحیح اور مذہب کی تعلیم کو غلط سمجھتا ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو مذہب کے دائرے میں شامل رکھنے کے لیے مذہبی تعلیمات کو اپنے خیالات اور طور طریقوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ایسے شخص کو ہم کودن نہیں کہیں گے کیونکہ کودن سے اتنی ہوشیاری کا کام کہاں بن آتا ہے؟ ہمیں مجبوراً اس کو بے ایمان کہنا پڑے گا۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ اس میں مذہب سے علانیہ بغاوت کرنے کے لیے کافی اخلاقی جرأت نہیں ہے اس لیے وہ منافقت کی راہ سے مذہب کا پیرو بنتا ہے، ورنہ کونسی چیز اس کے بجائے ایک ایسے مذہب کو چھوڑ دینے میں مانع ہے جس کی تعلیمات اس کی عقل کے فیصلوں کے خلاف ہیں، اس کے حقیقی افکار وعقائد کی ضد واقع ہوتی ہیں۔ اور اسے ان طریقوں پر چلنے سے روکتی ہیں جن پر وہ سچے دل سے چلنا چاہتا ہے اور واقع میں چل بھی رہا ہے۔

تیسرا گروہ اپنے مرتبۂ عقل کے لحاظ سے سب سے زیادہ فروتر ہے۔ پہلے

دونوں گروہوں کی غلطی تو یہ ہے کہ وہ عقل سے اتنا کام لیتے ہیں جتنا وہ نہیں کر سکتی۔ اور اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ سرے سے عقل سے کام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو اتنا کم کہ نہ لینے کے برابر۔ ایک صاحب عقل انسان کے لیے اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ یا فلاں قوم جو بڑی ترقی یافتہ ہے، وہ بھی اسی عقیدہ کی معتقد ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے دینی یا دنیاوی معاملات میں بعض طریقوں کی صرف اس لیے پیروی کرتا ہو کہ باپ دادا سے وہی طریقے چلے آرہے ہیں، یا بعض طریقوں کو صرف اس بنا پر اختیار کرتا ہو کہ اس کے عہد کی غالب قوموں میں وہی طریقے رائج ہیں، وہ دراصل اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ خود اس کے بھیجے میں دماغ اور دماغ میں سوچنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے پاس خود کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہو۔ اتفاقاً وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہو گیا اس لیے ہندو مذہب کو صحیح سمجھتا ہے، اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوتا تو اسلام کو برحق مانتا اگر عیسائی کی اولاد ہوتا تو عیسائیت پر جان دیتا۔ اسی طرح یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں فرنگی قومیں برسر اقتدار ہیں اس لیے وہ فرنگی طور طریقوں کو معیار تہذیب سمجھتا ہے۔ اگر چینی برسر اقتدار ہوتے تو یقیناً اس کے نزدیک چینی طور طریقے معیار تہذیب ہوتے اور اگر آج دنیا پر افریقہ کے حبشیوں کا تسلط ہو جاتے تو کوئی شک نہیں کہ یہ خفیف العقل انسان حبشیت کو انسانیت کا عطر سمجھنے لگے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لیے یہ کوئی دلیل ہی نہیں

ہے کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، یا دنیا میں آجکل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی اندھا دھند پیروی کرنا نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں کہ آنکھیں بند کر کے قدیم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگیں اور ہر راہرو کے دامن سے دامن باندھ کر چل کھڑے ہوں خواہ وہ کانٹوں کی طرف جا رہا ہو یا خندق کی طرف۔ ہمیں خدا نے عقل اسی لیے دی ہے کہ دنیا کے اچھے برے میں تمیز کریں، کھوٹے اور کھرے کو پرکھ کر دیکھیں، کسی کو رہنما بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ کدھر جانے والا ہے۔

اسلام ان تینوں گروہوں کو غلط کار ٹھہراتا ہے۔

پہلے گروہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ نہ تو یہ لوگ کسی روشنی والے کو ہادی اور رہنما مانتے ہیں، نہ ان کے پاس خود ہی حق کا نور ہے کہ اس کے اجالے میں راہ طے کریں۔ ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں محض اندازے اور اٹکل سے چل رہا ہو۔ ممکن ہے کہیں سیدھے رستے چلے، اور ممکن ہے کہیں گڑھے میں جا پڑے، اس لیے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے بلکہ زیادہ تر امکان غلطی ہی کا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ، إِنْ يَتَّبِعُونَ
إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (یونس-۶۶)

جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو خدائی کا حصہ دار ٹھہراتے اور ان کو پکارتے ہیں جانتے ہو کہ وہ کس چیز کے پیرو ہیں؟ وہ صرف گمان کے پیرو ہیں اور محض اندازے پر چلتے ہیں۔

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا (النجم-۲۸)

وہ محض گمان پر چلتے ہیں اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ہدایت سے ذرہ برابر بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰی اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ط (النجم-۲۳-۲۴)

وہ گمان اور اپنے نفس کی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے حالانکہ انکے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان کیلئے وہی چیز حق ہے جس کی وہ تمنا کرے

اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ (الجاثیہ-۲۳)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا؟ باوجودیکہ وہ علم رکھتا ہے مگر اللہ نے اسے گمراہ کردیا اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگادی اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب اللہ کے بعد کون ہے جو اس کی رہنمائی کرے گا۔

وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیۡرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (القصص-۵۰)

اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کی؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

نزول قرآن کے زمانے میں دوسرے گروہ کے نمائندے بنی اسرائیل تھے۔ اپنے

آپ کو موسوی اور متبع توراۃ کہا کرتے تھے۔ مگر عقائد اور معاملات میں اکثر و بیشتر موسیٰ علیہ السلام کے طریقے اور تورات کی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس پر لطف یہ تھا کہ اپنے اس انحراف پر نادم بھی نہ تھے۔ بجائے اس کے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو تورات کے مطابق ڈھالتے وہ تورات میں لفظی و معنوی تحریفیں کر کے اس کو اپنے افکار و اعمال کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ تورات کی اصلی تعلیمات کو چھپا کر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہی در اصل تورات کی تعلیمات ہیں۔ خدا کے جو بندے انہیں اس گمراہی پر متنبہ کرتے اور ان کی خواہشات کے خلاف کلام الٰہی کے اتباع کی دعوت دیتے تھے، ان کو وہ گالیاں دیتے، جھوٹا قرار دیتے، حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے:۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْهُمْ (المائدہ۔ ۳)

وہ الفاظ کو ان کے مواقع سے پھیر دیتے ہیں اور انہوں نے بہت سی ان نصیحتوں کو بھلا دیا ہے جو انہیں کی گئی تھیں۔ تمہیں برابر ان کی کسی نہ کسی چوری کی اطلاع ملتی رہتی ہے اس خیانت سے ان کے بہت کم آدمی بچے ہوتے ہیں۔

يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (آل عمران۔ ۷)

اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور کیوں جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈالتے ہو۔

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ (المائدہ - ۷۰)

جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ایسا پیغام لے کر آیا جو ان کے نفس کی خواہشوں کے مطابق نہ تھا، تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

اور پھر ان سے صاف کہہ دیتا ہے:۔

لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (المائدہ - ۶۸)

تم ہرگز راہ راست پر نہیں ہو، تا وقتیکہ توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو اور اس کتاب کو نہ مانو جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتاری گئی (یعنی قرآن)

تیسرے گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (البقرہ - ۱۷۰)

اور جب ان سے کہا گیا کہ اس ہدایت پر چلو جو اللہ نے اتاری ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے چاہے وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ

لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ۔ (المائدہ۔۱۰۴)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے، اور آؤ رسول کی طرف تو انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا وہ طریقہ اس صورت میں بھی ان کے لیے کافی ہے جبکہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں۔

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (الانعام۔۱۱۶)

اور اگر تو نے بہت سے ان لوگوں کی پیروی کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور ان کا طریقہ بالکل اٹکل اور اندازہ پر ہے۔

جو لوگ خود اپنی عقل و فہم سے کام نہیں لیتے، خود کھوٹے اور کھرے کو نہیں پرکھتے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کو قرآن اندھا، گونگا، بہرہ بے عقل قرار دیتا ہے۔ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (البقرہ۔۱۷۱) اور انہیں جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر، کیونکہ جانور تو عقل رکھتا ہی نہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں مگر اس سے کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔ (الاعراف۔۱۷۹)

ان تینوں گروہوں کو جن کے طریقے افراط و تفریط پر مبنی ہیں، رد کر دینے کے بعد قرآن ایسے لوگوں کا ایک گروہ بنانا چاہتا ہے جو اعتدال اور توسط کی راہ پر ہوں، اُمَّۃً وَّسَطًا ہوں، قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ ہوں۔

یہ اعتدال اور توسط کی راہ کیا ہے؟ یہ کہ پہلے تم ان سب پردوں کو چاک کر دو جو قدیم روایات اور جدید تعلیمات نے تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈال رکھے ہیں، عقل سلیم کی صاف روشنی میں آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز باطل؟ دہریت صحیح ہے یا خدا پرستی؟ توحید صحیح ہے یا شرک؟ انسان راہ راست پر چلنے کے لیے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے یا نہیں ہے؟ انبیاء علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے یا معاذ اللہ جھوٹے؟ قرآن جس طریقہ کو پیش کرتا ہے وہ سیدھا ہے یا ٹیڑھا؟ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ خدا کو ماننا انسانی فطرت کا عین مقتضیٰ ہے اور خدا حقیقت میں وہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر تمہارا ضمیر تسلیم کرے کہ انسان سیدھی راہ پانے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی روشنی کا یقیناً محتاج ہے اور یہ روشنی وہی ہے جو نوع بشری کے سچے رہبر انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو دیکھ کر تم کو یقین آجاتے کہ اس اعلیٰ سیرت کا انسان ہرگز دنیا کو دھوکہ نہیں دے سکتا اور انہوں نے جب رسول خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں، اگر قرآن کا مطالعہ کر کے تمہاری عقل یہ فیصلہ کر دے کہ انسان کے لیے اعتقاد اور عمل کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اس کتاب نے پیش کیا ہے اور یہ کتاب یقیناً کتاب الٰہی ہے، تو تمام دنیا کی ملامت و مخالفت سے بے خوف ہو کر ہر انسان کے ڈر اور فائدے کے لالچ سے دل کو پاک کر کے اس چیز پر ایمان لے آؤ جس کی صداقت پر تمہارا ضمیر گواہی دے رہا ہے۔

پھر جب تم نے عقل سلیم کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کر لی، اور باطل کو

کو چھوڑ کر حق پر ایمان لے آتے، تو عقل کے امتحان اور اس کی تنقید کا کام ختم ہوگیا۔ ایمان لانے کے بعد فیصلہ کرنے اور حکم دینے کا اختیار عقل سے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اب تمہارا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ ہر اس حکم کے آگے سر جھکا دینا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے تم کو دیا ہے۔ تم اپنی عقل کو ان احکام کے سمجھنے، ان کی باریکیوں اور حکمتوں تک پہنچنے، اور ان کو اپنی زندگی کے جزئیات پر منطبق کرنے میں استعمال کرسکتے ہو۔ مگر کسی حکم خداوندی میں چون وچرا کرنے کا حق تم کو نہیں ہے، خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آتے یا نہ آتے، خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، خواہ اللہ کا ارشاد اور رسول کا فرمان دنیا کے رسم ورواج اور طور طریقوں کے مطابق ہو یا منافی، تمہارا کام بہرحال اس کے آگے سر جھکا دینا ہے۔ کیونکہ جب تم نے خدا کو مان لیا، رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر لیا اور یقین کر لیا کہ خدا کا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اپنے دل سے گھڑی ہوئی کوئی بات پیش نہیں کرتا وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، تو اس یقین و اذعان کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ تم خود اپنی عقل کے فیصلوں پر کتاب اللہ اور سنت رسول کے فیصلوں کو ترجیح دو اور جو عقائد یا امر و نہی کے احکام خدا کی طرف سے خدا کے رسول نے بیان کئے ہیں ان کو اپنی عقل، اپنے علم، اپنے تجربات، یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں مومن ہوں اور پھر چون وچرا بھی کرتا ہے، وہ اپنے قول کی آپ تردید کرتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ایمان اور چون وچرا میں کھلا ہوا تناقض ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت

کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ چوں و چرا کا دوسرا نام انار کی ہے۔

اسی اعتدال اور توسط کے طریقہ کا نام "اسلام" ہے اور جو گروہ اس راستہ پر چلتا ہو اس کا نام "مسلم" ہے۔

اسلام کے معنی انقیاد، اطاعت اور تسلیم کے ہیں۔ اور مسلم وہ ہے جو حکم دینے والے کے امر اور منع کرنے والے کی نہی کو بلا اعتراض تسلیم کرے۔ پس یہ نام خود ہی اس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ ان تینوں گروہوں اور ان کے طریقوں کو چھوڑ کر یہ چوتھا گروہ ایک نئے مسلک کے ساتھ اسی لیے قائم کیا گیا ہے کہ یہ خدا اور رسول کے حکم کو ماننے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس گروہ کا کام یہ نہیں ہے کہ ہر معاملے میں صرف اپنی عقل کی پیروی کرے، نہ یہ ہے کہ احکام الٰہی میں سے جو کچھ اس کی اغراض کے مطابق ہو اس کو مانے اور جو اغراض کے خلاف ہو اس کو رد کر دے، نہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کو چھوڑ کر انسانوں کی اندھی تقلید کرے خواہ وہ انسان مردہ ہوں یا زندہ۔

اب اس بات میں قرآن مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول کا حکم آجائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

(الاحزاب۔ ۳۶)

کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ

کردے تو ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

وہ کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ کو ماننا اور کچھ کو رد کردینا، دنیا اور آخرت میں رسوا کن ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرہ)

کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو اور آخرت میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

وہ کہتا ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الٰہی کے مطابق ہونا چاہیئے، خواہ وہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ ۔ ۴۸)

تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتاری ہے اور جو حق تیرے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

وہ کہتا ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ[1] اور ہر فیصلہ جو کتاب الٰہی

---

[1] المائدہ ۔ ۴۷

کے خلاف ہے، جاہلیت کا فیصلہ ہے۔ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ (المائدہ-۵۰)

وہ کہتا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اللہ اور اس کے رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم حقیقت میں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو تو جس کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پیدا ہو، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔ اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی اچھا ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری جانب بھیجی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے بھیجی گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے معاملہ میں حکم بنائیں حالانکہ انہیں اس کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے دور ہٹا لے جائے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ وہ تجھ سے کنی کاٹ جاتے ہیں ...... ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے ...... نہیں! تیرے پروردگار کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائیں۔ اور یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ جو فیصلہ تو کرے اس پر وہ اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور بے چون و چرا اس کے آگے سر جھکا دیں۔" (النساء-۸، ۹)

ان تصریحات سے "اسلام" اور "مسلم" کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی۔ اب ہم سبب

لوگوں کو جنہوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو مسلم لکھوایا ہے غور کرنا چاہیئے
کہ ہم پر لفظ مسلم کا اطلاق کس حد تک ہوتا ہے اور جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں
اس کو اسلام سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟

(ترجمان القرآن۔ رجب ۵۲ھ، نومبر ۱۹۳۳ء)

مسلمان کی طاقت کا اصلی منبع

دوسری صدی ہجری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ سجستان[1] ُدرِ رُخج کے فرماں روا نے جس کا خاندانی لقب رُتبیل تھا بنی اُمیّہ کے عُمّال کو خراج دینا بند کر دیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلبِ خراج کے لیے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا:۔

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹّے پڑے رہتے تھے اور کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گزر گئے۔ رُتبیل نے کہا:۔

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں، مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے تم سے زیادہ طاقتور تھے"

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رُتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

---

[1] موجودہ افغانستان

یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین و تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ آئمہ مجتہدین کا زمانہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھا رہے تھے، ایران روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے اور ساز و سامان، شان و شوکت، اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی، سمع و طاعت کا نظام قائم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فاقہ کش خستہ حال صحرا نشینوں سے زور آزمائی کر چکے تھے انہوں نے ان سر و سامان والوں اور ان بے سر و سامانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بداوت و حضریت کے فرق پر محمول کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوصِ نیت، اخلاق اور اطاعت خدا اور رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہی چیزیں تھیں، ان کی قوت نہ کثرتِ تعداد پر مبنی تھی، نہ اسباب و آلات کی افراط پر، نہ مال و دولت پر، نہ علوم و صناعات کی مہارت پر، نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر، وہ صرف ایمان و عمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا۔ اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھا دی تھی۔ جب قوت و عزت کا یہ سرمایہ ان کے پاس تھا تو یہ قلتِ تعداد اور

بے سروسامانی کے باوجود طاقت ور اور معزز تھے۔ اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوگیا تو کثرت تعداد اور سروسامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

زمیل نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آراستہ فوجیں، اس کے آلات جنگ، اس کے خوش خوردخوش پوش سپاہی، اور اس کے وسیع ذرائع ووسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات، اور اس کے بلند تخیلات ہیں۔ یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکہ چلا دیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کر دیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں بلکہ دلوں کا مالک بھی بنا دیتی ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چپلیاں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے، بے رونق چہروں والے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے لوگ دنیا پر وہ رعب، وہ سطوت وجبروت، وہ قدرومنزلت وہ اعتبار واقتدار جما دیتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شاندار لباس پہننے والے، بڑے ڈیل ڈول والے، بارونق چہروں والے، اونچی بارگاہوں والے بڑی بڑی منجنیقیں اور ہولناک دبابے رکھنے والے نہیں جما سکتے۔ اخلاقی طاقت کی فراوانی مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے۔ مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو بھی گیا تو ناقص اور عارضی ہوگا۔ کامل اور پائدار نہ ہوگا۔

دل کبھی مسخر نہ ہوں گے۔ صرف گردنیں جھک جائیں گی۔ اور وہ بھی اکڑنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد رہیں گی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ و روغن، نقش و نگار، زینت و آرائش صحن و چمن اور ظاہری خوشنمائی سے نہیں ہوتا۔ نہ مکینوں کی کثرت، نہ ساز و سامان کی افراط اور اسباب و آلات کی فراوانی اس کو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں، ستونوں کو گھن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہو جائیں تو اس کو گرنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، خواہ وہ مکینوں سے خوب معمور ہو، اور اس میں کروڑوں روپے کا مال و اسباب بھرا پڑا ہو، اور اس کی سجاوٹ نظروں کو بھاتی اور دلوں کو موہ لیتی ہو۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو۔ تمہاری نظریں مد نظر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ مگر حوادث زمانہ کا معاملہ نمائشی مظاہر سے نہیں بلکہ اندرونی حقائق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں۔ ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں مضبوط اور مستحکم ہوں تو زمانے کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائیں گے اور وہ ان پر غالب آ جائے گی خواہ وہ زینت و آرائش سے یکسر محروم ہو۔ ورنہ حوادث کی ٹکریں آخر کار اس کو پاش پاش کر کے رہیں گی اور وہ اپنے ساتھ مکینوں اور اسباب زینت کو بھی لے بیٹھے گی۔

ٹھیک یہی حال حیات قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقتور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسباب عیش، اس کے فنون لطیفہ، اس کے کارخانے، اس کے کالج نہیں

ہیں، بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے، اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہونا اور اعمال پر حکمران بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں، یعنی اصول کی صحت، ان پر پختہ ایمان اور عملی زندگی پر ان کی کامل فرماں روائی، حیات قومی میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک عمارت میں اس کی مستحکم بنیادوں، اس کی پختہ دیواروں اور اس کے مضبوط ستونوں کی ہے۔ جس قوم میں یہ تینوں چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہوں وہ دنیا پر غالب ہو کر رہے گی۔ اس کا کلمہ بلند ہوگا، خدا کی زمین میں اس کا سکہ چلے گا، دلوں میں اس کی دھاک بیٹھے گی، گردنیں اس کے حکم کے آگے جھک جائیں گی اور اس کی عزت ہوگی، خواہ وہ جھونپڑیوں میں رہتی ہو، پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہو، فاقوں سے اس کے پیٹ پچکے ہوتے ہوں، اس کے ہاں ایک بھی کالج نہ ہو، اس کی بستیوں میں ایک بھی دھواں اڑانے والی چمنی نظر نہ آسکے، اور علوم و صناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامانِ ترقی سمجھ رہے ہو وہ محض عمارت کے نقش و نگار ہیں، اس کے قوائم و ارکان نہیں ہیں۔ کھوکھلی دیواروں پر اگر سونے کے پترے بھی چڑھا دو گے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچا سکیں گے۔

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

وہ اسلام کے اصولوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس اٹل اور غیر متغیر فطرت کے مطابق ہیں جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے جو دین ان اصولوں پر قائم کیا گیا ہے وہ دینِ قیم ہے۔ یعنی ایسا دین جو معاش و معاد کے جملہ معاملات کو ٹھیک ٹھیک طریقوں پر قائم کر دینے والا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ

حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم ۳۰)

پھر وہ کہتا ہے کہ اس دین قیم پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اس کا نتیجہ خود بخود ظاہر ہوگا کہ دنیا میں تم ہی سربلند ہو گے، تم ہی کو زمین کا وارث بنایا جائے گا، تم ہی خلعتِ خلافت سے سرفراز ہو گے۔ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء ۱۰۵) وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۱۳۹) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (النور ۵۵) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدہ ۵۶)

بخلاف اس کے جو لوگ بظاہر دین کے دائرے میں داخل ہیں، مگر دین نہ تو ان کے دلوں میں بیٹھا ہے اور نہ ان کی زندگی کا قانون بنا ہے، ان کے ظاہر تو بہت شاندار ہیں۔ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ اور ان کی باتیں بہت مزیدار ہیں وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ، مگر حقیقت میں وہ لکڑی کے کندے ہیں جن میں جان نہیں كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔ وہ خدا سے بڑھ کر انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں کہ دیکھنے میں پانی نظر آئیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں۔ اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا۔ ایسے لوگوں کو اجتماعی قوت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ خلوص نیت کے ساتھ کسی کام میں اشتراک عمل نہیں

کر سکتے۔ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ۔
ان کو وہ قوت ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی جو صرف مومنین صالحین کا حصہ ہے۔
لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ۔ ان کو دنیا
کی امامت کا منصب کبھی نہیں ملے گا۔ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ ۔ ان
کے لیے بجز اس کے اور کوئی انجام نہیں کہ دنیا میں بھی ذلت وخواری اور آخرت
میں بھی عذاب وعقاب۔ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ۔ (البقرہ۔ ۱۱۴)

آپ تعجب کریں گے کہ قرآن نے مسلمانوں کی ترقی اور ان کے ایک حکمراں
جماعت بننے اور سب پر غالب آجانے کا ذریعہ صرف ایمان وعمل صالح کو قرار دیا
اور کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونیورسٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قائم کرو، جہاز بناؤ،
کمپنیاں قائم کرو، بینک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو، اور لباس، معاشرت،
انداز واطوار میں ترقی یافتہ قوموں کی نقل کرو۔ نیز اس نے تنزل وانحطاط اور دنیا
وآخرت کی ذلت ورسوائی کا واحد سبب بھی نفاق کو ٹھہرایا نہ کہ ان اسباب کے
فقدان کو جنہیں آجکل دنیا اسباب ترقی سمجھتی ہے۔

لیکن اگر آپ قرآن کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو آپ کا یہ تعجب خود رفع ہو جائے
گا۔ سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے یہ ہے کہ مسلمان جس شے کا نام
ہے اس کا قوام بجز اسلام کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے
اس کی حقیقت صرف اسلام سے متحقق ہوتی ہے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان رکھے
جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لاتے ہیں اور ان قوانین کا اتباع کرے جن کو آنحضرت

علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے سے نازل کیا گیا ہے، تو اس کا اسلام متحقق ہو جائے گا خواہ ان چیزوں میں کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو جو اسلام کے ماسوا ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ ان تمام زیوروں سے آراستہ ہو جو زینتِ حیاتِ دنیا کے قبیل سے ہیں۔ مگر ایمان اس کے دل میں نہ ہو اور قوانین اسلامی کے اتباع سے اس کی زندگی خالی ہو تو وہ گریجویٹ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، کارخانہ دار ہو سکتا ہے، بینکر ہو سکتا ہے، جنرل یا امیر البحر ہو سکتا ہے، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ پس کوئی ترقی کسی مسلمان شخص یا قوم کی ترقی نہ ہوگی جب تک کہ سب چیزوں سے پہلے اس شخص یا قوم میں حقیقتِ اسلامی متحقق نہ ہو جائے۔ اس کے بغیر وہ ترقی خواہ کسی اور کی ترقی ہو مسلمان کی ترقی نہ ہوگی، اور ایسی ترقی ظاہر ہے کہ اسلام کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم سرے سے مسلمان نہ ہو، اور اس کے افکار و اخلاق اور نظامِ اجتماعی کی اساس اسلام کے سوا کسی اور چیز پر ہو۔ ایسی قوم کے لیے بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ان اخلاقی، سیاسی، معاشی اور عمرانی اصولوں پر کھڑی ہو سکے جو اسلام سے مختلف ہیں، اور اس ترقی کے منتہی کو پہنچ جائے جس کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے ترقی سمجھتی ہو۔ لیکن یہ بالکل ایک امرِ دیگر ہے کہ کسی قوم کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کی بنیاد اسلام پر ہو، اور اسلام ہی میں وہ عقیدے اور عمل دونوں کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایسی قوم مادی ترقی کے وسائل خواہ کتنی ہی کثرت اور فراوانی کے ساتھ مہیا کر لے، اس کا ایک مضبوط اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے اٹھنا اور دنیا میں سر بلند ہونا قطعاً غیر ممکن

ہے کیونکہ اس کی قومیت اور اس کے اخلاق اور تہذیب کی اساس جس چیز پر ہے، وہی کمزور ہے اور اساس کی کمزوری ایسی کمزوری ہے جس کی تلافی محض اوپری زینت کے سامان کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجہ پر ہیں۔ اساس کا استحکام ان سب پر مقدم ہے۔ جب مستحکم ہو جاتے تو مادی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں جو اس بنیاد کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں لیکن اگر وہی مضمحل ہو، دل میں اسی کی جڑیں کمزور ہوں اور زندگی پر اسی کی گرفت ڈھیلی ہو، تو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوم کے اخلاق کا فاسد ہونا، سیرتوں کا بگڑ جانا، معاملات کا خراب ہو جانا، نظامِ اجتماعی کا سست ہونا اور قوتوں کا پراگندہ ہو جانا ناگزیر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ قوم کی طاقت کمزور ہو جائے اور بین الملی قوتوں کے ترازو میں اس کا پلڑا روز بروز ہلکا ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ دوسری قومیں اس پر غالب آجائیں۔ ایسی حالت میں مادی اسباب کی فراوانی اور سند یافتہ فضلا کی افراط اور خارجی زیب و زینت کی چمک دمک کسی کام نہیں آسکتی۔

ان سب سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ہے۔ قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ "تم ہی سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔" اور "اللہ کی پارٹی والے ہی غالب ہوں گے۔ اور جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں گے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی۔" اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ کس بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا

ہے کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادی وسائل کی مالک ہوں ان پر مسلمان صرف ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے غالب آئیں گے؟

اس عقدے کو خود قرآن حل کرتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ. مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج ۷۴)

لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اس کو غور سے سنو۔ خدا کو چھوڑ کر تم جن چیزوں کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کام کیلئے مل کر زور لگائیں اور اگر ایک مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے وہ چیز چھڑا لینے کی قدرت بھی ان میں نہیں۔ مطلوب بھی ضعیف اور اس کا طالب بھی ضعیف ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسی کرنی چاہیئے تھی حالانکہ درحقیقت اللہ ہی قدرت اور عزت والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ (عنکبوت ۴۱)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو کارساز ٹھہرایا۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے مکڑی کہ وہ گھر بناتی ہے حالانکہ سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مادی طاقتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان کا اعتماد دراصل

ایسی چیزوں پر ہے جو بذات خود کسی قسم کی بھی قوت نہیں رکھتیں۔ ایسے بے زوروں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی ویسے ہی بے زور ہو جاتے ہیں۔ جیسے ان کے سہارے بے زور ہیں۔ وہ اپنے نزدیک جو مستحکم قلعے بناتے ہیں وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں۔ ان میں کبھی یہ طاقت ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکیں جو حقیقی قدر و عزت رکھنے والے خدا پر اعتماد کر کے اٹھیں۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ۔ ۳۴)

جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط رسی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

قرآن دعوے کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ جب کبھی اہل ایمان اور اہل کفر کا مقابلہ ہوگا تو غلبہ اہل ایمان ہی کو حاصل ہوگا۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الفتح۔ ۳)

اور اگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تم سے جنگ کریں گے تو ضرور پیٹھ پھیر جائیں گے اور کوئی یار و مددگار نہ پائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تغیر نہ پاؤ گے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا (آل عمران۔ ۱۶)

ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے خدائی میں ان
چیزوں کو شریک کر دیا ہے جن کو خدا نے کوئی تمکن نہیں بخشا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے لڑتا ہے اس کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے اور جس کے ساتھ خدائی طاقت ہو اس کے مقابلہ میں کسی کا زور چل ہی نہیں سکتا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ (محمد ۱)
وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (انفال ۲)

یہ اس لیے کہ ایمانداروں کا مددگار تو اللہ ہے اور کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔
جب تو نے تیر پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا۔

یہ تو مومن صالح کی سطوت کا حال ہے۔ دوسری طرف یہ بھی خدا کا قانون ہے کہ جو شخص ایماندار ہوتا ہے، جس کی سیرت پاکیزہ ہوتی ہے، جس کے اعمال نفسانیت کی آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں، جو ہوائے نفس اور اغراض نفسانی کے بجائے خدا کے مقرر کئے ہوئے قانون کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے، اس کی محبت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، نگاہیں اس کی طرف احترام سے اٹھتی ہیں معاملات میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، دوست تو دوست دشمن تک اس کو صادق سمجھتے ہیں اور اس کے عدل، اس کی عفت اور اس کی وفاشعاری پر بھروسہ کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (مریم ۶)

جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، اللہ ان کی محبت دلوں میں ڈال دیگا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (ابراہیم - ۱۴)

ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کے ساتھ جما دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل - ۹۷)

جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو تو ہم ضرور اس کو بہترین زندگی بسر کرائیں گے اور ان بہترین اعمال کا اجر دیں گے جو وہ کرتے ہیں۔

مگر یہ سب کس چیز کے نتائج ہیں؟ محض زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کے نہیں، مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور معاشرت کے چند مخصوص اطوار اختیار کرنے اور چند گنی چنی رسمیات ادا کر لینے کے نہیں۔ قرآن حکیم ان نتائج کے ظہور کے لیے ایمان اور عملِ صالح کی شرط لگاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی حقیقت تمہارے قلب و روح میں اس قدر جاگزیں ہو جائے کہ تمہارے تخیلات و افکار اور اخلاق و معاملات سب پر اسی کا غلبہ ہو، تمہاری ساری زندگی اسی کلمہ طیبہ کے معنوی قالب میں ڈھل جائے، تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال راہ نہ پا سکے جو اس کلمہ کے معنی سے مختلف ہو اور تم سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اس کلمہ کے مقتضیٰ کے خلاف ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو زبان سے ادا کرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں اس کے ساتھ ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ تمہاری رگ رگ میں تقویٰ کی روح سرایت کر جائے۔ اللہ کے سوا تمہاری گردن کسی طاقت کے آگے نہ جھکے۔ اللہ کے سوا تمہارا ہاتھ کسی کے

آگے نہ جھکے۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف تمہارے دل میں نہ رہے۔ تمہاری محبت اور تمہارا بغض اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو۔ اللہ کے قانون کے سوا تمہاری زندگی پر کسی اور کا قانون نافذ نہ ہو۔ تم اپنے نفس اور اس کی ساری خواہشوں اور اس کے تمام مرغوبات و محبوبات کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلہ میں تمہارے پاس سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے سوا کوئی اور قول و فعل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو تمہاری قوت صرف تمہارے اپنے نفس اور جسم کی قوت نہ ہوگی بلکہ اس احکم الحاکمین کی قوت ہوگی جس کے آگے زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سربسجود ہے اور تمہاری ذات اس نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے جلووں سے منور ہو جائے گی جو تمام عالم کا حقیقی محبوب و معشوق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی چیز مسلمانوں کو حاصل تھی۔ پھر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس زمانہ میں جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا اس کی کایا پلٹ گئی۔ مس خام سے یکایک وہ کندن بن گیا۔ اس کی ذات میں ایسی کشش پیدا ہوئی کہ دل اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس پر جس کی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجسم دیکھ رہا ہے۔ وہ اَن پڑھ، مفلس، فاقہ کش، پشمینہ پوش اور بوریا نشین ہوتا مگر پھر بھی اس کی ہیبت دلوں میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان و شوکت والے فرمان رواؤں کو نصیب نہ تھی۔ ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جدھر وہ جاتا اس کی روشنی اطراف و اکناف میں پھیل جاتی اور اس چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے۔ پھر جو اس روشنی کو قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی

جرأت کرتا تو اس کو جلانے اور فنا کر دینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔
ایسی ہی قوتِ ایمانی اور طاقت وسیرت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ ساڑھے تین سو سے زیادہ نہ تھے تو انہوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا۔ اور جب وہ چند لاکھ کی تعداد کو پہنچے تو ساری دنیا کو مسخر کر لینے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوتے اور جو قوت ان کے مقابلہ پر آئی پاش پاش ہو گئی۔
جیسا کہ کہا جا چکا ہے مسلمانوں کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرتِ صالحہ کی طاقت ہے جو صرف ایک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ حقیقت دل میں جاگزیں نہ ہو، محض زبان پر یہ الفاظ جاری ہوں مگر ذہنیت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو، لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی انسان وہی کا وہی رہے جو اس سے پہلے تھا اور اس میں اور لا الہ الا اللہ کا انکار کرنیوالوں میں اخلاقی وعملی حیثیت سے کوئی فرق نہ ہو، وہ بھی انہی کی طرح غیر اللہ کے آگے گردن جھکاتے اور ہاتھ پھیلاتے انہی کی طرح غیر اللہ سے ڈرنے اور غیر خدا کی رضا چاہنے اور غیر خدا کی محبت میں گرفتار ہو، انہی کی طرح ہوائے نفس کا بندہ ہو اور قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے، اس کے خیالات اور ارادوں اور نیتوں میں بھی وہی گندگی ہو جو ایک غیر مومن کے خیالات، ارادات اور نیات میں ہو سکتی ہے اور اس کے اقوال وافعال و معاملات بھی ویسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہوتے ہیں تو پھر مسلمان کو نامسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ روحِ ایمان اور روحِ تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان ویسا ہی ایک بشر تو ہے جیسا ایک نامسلمان ہے۔ اس کے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی

طاقت اور مادی وسائل ہی کے اعتبار سے ہوگا، اور اس مقابلہ میں جو طاقت ور ہوگا وہ کمزور پر غالب آجائے گا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے صفحات میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے تھے اور اٹک کے کنارے سے لے کر اٹلانٹک کے سواحل تک اسلام پھیلا دیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں۔ جن آبادیوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بستے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

(ترجمان القرآن۔ شوال ۶۳ھ۔ جنوری ۴۵ء)

کیشِ مرداں نہ کہ مذہبِ گوسفنداں

مسئلہ سُود پر میرے مضامین کو دیکھ کر ایک خیال کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری نظامِ سیاسی طاقت کے ساتھ ہمارے گردوپیش کی پوری معاشی دنیا پر مسلط ہو چکا ہے۔ معیشت کی گاڑی اصولِ سرمایہ داری کے پہیوں پر چل رہی ہے، سرمایہ دار ہی اس کو چلا رہے ہیں اور وہی قومیں اس کے ذریعہ سے منزلِ ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں جن کے لیے پیدائش دولت اور صرفِ دولت کے باب میں کوئی مذہبی یا اخلاقی قید نہیں ہے۔ دوسری طرف ہماری اجتماعی قوت منتشر ہے۔ دنیا کے نظمِ معیشت کو بدلنا تو درکنار ہم خود اپنی قوم میں بھی اسلامی نظمِ معیشت کو از سرِ نو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب اگر ہماری مذہبی قیود ہم کو زمانے کے چلتے ہوتے نظامِ معاشی میں پورا پورا حصہ لینے سے روک دیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہماری قوم معاشی ترقی و خوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتے گی۔ ہم مفلس ہوتے جائیں گے اور ہمسایہ قومیں دولت مند ہوتی چلی جائیں گی۔ پھر ہماری یہ معاشی کمزوری ہم کو سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بھی ذلیل اور پست کرے گی۔ یہ محض وہم اور اندیشہ نہیں ہے بلکہ واقعات کی دنیا میں یہی نتیجہ ہم کو نظر آرہا ہے، برسوں سے نظر آرہا ہے، اور مستقبل میں ہمارا جو کچھ انجام ہونے والا ہے اس کے آثار کچھ ایسے دھندلے نہیں ہیں

کہ ان کو نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ پس ہم کو محض شریعت کا قانون بتانے سے کیا فائدہ؟ اسلام کے معاشی اصول بیان کرنے سے کیا حاصل؟ ہم کو یہ بتاؤ کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی پابندی کے ساتھ ہمارے لیے اپنی معاشی حالت کو سنبھالنے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اگر نہیں ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت یقیناً پیش آئے گی۔ یا تو مسلمان بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ یا پھر وہ بھی دوسری قوموں کی طرح مجبور ہوں گے کہ ایسے تمام قوانین کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

یہ سوال صرف مسئلہ سود ہی تک محدود نہیں ہے۔ دراصل اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر زندگی کے تمام شعبوں میں سے محض معیشت ہی کا شعبہ ایسا ہوتا جس پر ایک غیر اسلامی نظام مسلط ہو گیا ہوتا تو شاید معاملہ نسبتاً بہت ہلکا ہوتا۔ مگر واقعات کی شہادت کچھ اور ہے۔ اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالیے۔ خود اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ زندگی کا کونسا شعبہ ایسا پایا جاتا ہے جس پر غیر اسلام کا تسلط نہیں ہے؟ کیا اعتقادات اور افکار و تخیلات پر الحاد و دہریت یا کم از کم شک و ریب کا غلبہ نہیں؟ کیا تعلیم پر ناخدا شناسی کی حکومت نہیں؟ کیا تمدن و تہذیب پر فرنگیت کا استیلا نہیں؟ کیا معاشرت کی جڑوں تک میں مغربیت اتر نہیں گئی ہے؟ کیا اخلاق اس کے غلبہ سے محفوظ ہیں؟ کیا معاملات اس کے تسلط سے آزاد ہیں؟ کیا قانون اور سیاست اور حکومت کے اصول و فروع نظریات اور عملیات میں سے کوئی چیز بھی اس کے اثر سے پاک ہے؟

جب حال یہ ہے تو آپ اپنے سوال کو معیشت اور اس کے بھی صرف

ایک پہلو تک کیوں محدود رکھتے ہیں؟ اس کو وسیع کیجئے پوری زندگی پر پھیلا دیجئے۔ یوں کہئے کہ زندگی کے دریا نے اپنا رُخ بدل دیا ہے، پہلے وہ اس راستہ پر بہ رہا تھا جو اسلام کا راستہ تھا۔ اب وہ اس راستہ پر بہ رہا ہے جو غیر اسلام کا راستہ ہے۔ ہم اس کے رخ کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتے۔ ہم میں اتنی قوت بھی نہیں کہ اس کی رَو کے خلاف تیر سکیں۔ ہم کو ٹھہرنے میں بھی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اب ہمیں کوئی ایسی صورت بتاؤ کہ ہم مسلمان بھی رہیں اور اس دریا کے بہاؤ پر اپنی کشتی کو چھوڑ بھی دیں، عازم کعبہ بھی رہیں اور اس قافلہ کا ساتھ بھی نہ چھوڑیں جو ترکستان کی طرف جا رہا ہے۔ ہم اپنے خیالات، نظریات، مقاصد اصولِ حیات اور مناہج عمل میں نامسلمان بھی ہوں اور پھر مسلمان بھی ہوں۔ اگر ان اضداد کو جمع کرنے کی کوئی صورت تم نے نہ نکالی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہم اسی دریا کے ساحل پر مر رہیں گے، یا پھر یہ اسلام کا لیبل جو ہماری کشتی پر لگا ہوا ہے ایک دن کھرچ ڈالا جائے گا اور یہ کشتی بھی دوسری کشتیوں کے ساتھ دریا کے دھارے پر بہتی نظر آئے گی۔

ہمارے روشن خیال اور "تجدد پسند" حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت، جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے، ہوا کا رُخ اسی طرف ہے، دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں! اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیارِ اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان اس پرانے معیارِ اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث

ہوا ارشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اُٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوگی کہ جو چیز دنیا سے اُٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں! تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ نہیں۔ مدعا یہ کہلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے! سود پر تقریر ہو۔ ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہو گئی ہے غرض یہ کہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سے جس شعبے میں بھی وہ اصول اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے زمانے کا رنگ اور ہوا کا رخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تقلید مغربی یا درحقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ عمارتِ اسلامی کے اجزاء میں سے ہر اس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔
ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو، ان سب کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک دیوار، ایک ایک کمرے اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علیحدہ علیحدہ تجویزیں پیش کرنے، اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ کیوں نہیں کہتے کہ یہ پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے، اس کا رخ ہوا کے رخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے تو بحث کرنا فضول ہے۔ ان کے لیے تو صاف اور سیدھا سا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی زحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو دوسرا خوش وضع خوشنما، خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے پر بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا ڈھیل کھر چنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو کشتیاں پہلے سے بہہ رہی ہیں انہی میں سے کسی میں نقل مقام فرمائیے۔ جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں، ہوا پرست ہیں، اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جاتے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے۔ اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جاتے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل اور دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے، اس لیے اپنے باطن سے لے کر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں۔ کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے۔ اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیریں گے، اپنے ہونٹ موٹے کریں گے، اپنے بالوں میں حبشیوں کے سے گھونگھر پیدا کریں گے، ہر اس شے کی پوجا کرنے لگیں گے جو حبش سے ان کو پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں ہے، بخدا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں

سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور دنیا میں صرف
چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جن کی تعریف یہ ہو کہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ
لَائِمٍ[1] تو اسلام اب سے بدرجہا زیادہ طاقت ور ہوگا اور ان کروڑوں کا نکل جانا
اس کے حق میں ایسا ہوگا جیسے کسی مریض کے جسم سے پیپ اور کچ لہو نکل جاتے۔

نَخْشٰى أَنْ تُصِيْبَنَا دَائِرَةٌ (المائدہ - ۵۲) ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آجائے گی۔

یہ آج کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ بہت پرانی آواز ہے جو منافقوں کی زبان سے
بلند ہوتی رہی ہے۔ یہی آواز نفاق کی اس بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی
ہے۔ اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخالفینِ اسلام کے کیمپ کی طرف لپکتے رہے
ہیں۔ ہمیشہ سے انہوں نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق
ہی سمجھا ہے۔ ہمیشہ سے ان کو احکام خدا اور رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا رہا ہے۔
اطاعت میں جان و مال کا زیاں اور نافرمانی میں حیاتِ دنیا کی ساری کامرانیاں ہمیشہ
سے ان کو نظر آتی رہی ہیں۔ پس ان کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتدا میں بدلا گیا تھا،
نہ اب بدلا جا سکتا ہے، اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔ یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے
لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے

---

[1] وہ اللہ کے محبوب ہوں اور اللہ ان کا محبوب ہو، مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں
پر سخت ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت
کا انہیں خوف نہ ہو۔ (المائدہ - ۵۴)

ہوا کے رُخ پر اڑنے والے خس وخاشاک، اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے بہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رُخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رُخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے، وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا، اس کا رُخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروانہ ہوگی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرلے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو، حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں، اور پانی کی موجیں اس کو نیم جاں کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رَو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پاسکے گا۔

قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ابتدا سے لے کر آج تک کے علمبردارانِ اسلام کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اڑا لے جائے ادھر اُڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہا لے جائے اُدھر بہہ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اسی رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر مدعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لیے اور حیاتِ دنیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لیے اور زمانے کی نیرنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ اِس ذاتِ حق کی طرف سے تو جو پیغام بھی آیا ہے اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کرے، اس کے خلاف چلنے والے راستے ہوں ان کو مٹائے، اور دنیا کو ان سے ہٹانے کی کوشش کرے، ایمانداروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستہ پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کریں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض کے لیے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں۔ نقصان برداشت کیے ہیں اور جانیں دی ہیں۔ ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتارِ زمانہ کو کبھی اپنا مقتدا نہیں بنایا۔

اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ہدایتِ آسمانی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور ان سے خوف زدہ ہو کر کسی ایسے راستہ پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوشحال، کامیاب اور

سر بلند نظر آتے ہیں، تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستہ پر جاتے۔ مگر وہ بزدل اور حریص انسان اپنے نفس کو اور دنیا کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے بتاتے ہوتے طریقہ کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے؟ نافرمانی خود ایک بڑا جرم ہے۔ اس پر جھوٹ اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھانا مقصود ہے؟

یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رُخ پر بہہ گیا ہے اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوتے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لاتے تو زندگی کا یہ دریا کس رُخ پر بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فواحش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر ظالمانہ جاگیرداری و سرمایہ داری، اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک تن واحد نے اُٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا۔ تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلہ میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا، اور چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دنیا کے رُخ کو پھیر کر اور زمانہ کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

تازہ ترین مثال اشتراکی تحریک کی ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی بزدل مرغ بادنما اس وقت یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا

کہ جو نظام ایسی ہولناک سیاسی اور جنگی قوت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے اس کو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ مگر انہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس نامی اٹھا اور اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومتوں نے اس کی مخالفت کی، وطن سے نکالا گیا ملک ملک کی خاک چھانتا پھرا۔ تنگدستی اور مصیبت سے دوچار ہوا۔ مگر مرنے سے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقت ور جماعت پیدا کر گیا۔ جس نے چالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے زیادہ خوفناک طاقت کو الٹ کر رکھ دیا بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دیں اور اپنا ایک معاشی اور تمدنی نظریہ اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج دنیا میں اس کے متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور ان ممالک کے قوانین بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن پر سرمایہ داری کی حکومت گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہے۔

مگر انقلاب یا ارتقا۔ ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے، اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں ڈھال دینے کا نام ہے، مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے، موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا، جو لوگ اپنا کوئی اصول، کوئی مقصدِ حیات، کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جو بلند مقصد کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جو خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی ہمت نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو، جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں، ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے۔ انہی نے اپنے جہاد اور اپنی قربانیوں سے زندگی کے

دریا کا رُخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں۔ مناہج عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ کر چھوڑا ہے۔

پس یہ نہ کہو کر دنیا جس راستہ پر جا رہی ہے اس سے وہ پھیری نہیں جا سکتی اور زمانے کی جو روش ہے اس کا اتباع کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ مجبوری کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بجائے تم کو خود اپنی کمزوری کا سچا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اور جب تم اس کا اعتراف کر لوگے تو تم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کمزور کے لیے دنیا میں نہ کوئی مذہب ہو سکتا ہے، نہ کوئی اصول اور نہ کوئی ضابطہ۔ اس کو تو ہر زور آور سے دبنا پڑے گا۔ ہر طاقت ور کے آگے جھکنا پڑے گا۔ وہ کبھی اپنے کسی اصول اور کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مذہب اس کے لیے اپنے اصول بدلتا چلا جائے تو وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہ رہے گا۔

یہ بھی ایک دھوکا ہے کہ اسلام کی قیود تمہاری خوشحالی اور ترقی میں مانع ہیں آخر تم اسلام کی کس قید کی پابندی کر رہے ہو؟ کون سی قید ہے جس سے تم آزاد نہیں ہوتے؟ اور کونسی حد ہے جس کو تم نے نہیں توڑا؟ تم کو جو چیزیں تباہ کر رہی ہیں ان میں سے کس کی اجازت اسلام نے تم کو دی تھی؟ تم تباہ ہو رہے ہو اپنی فضول خرچیوں سے جن کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ کا سود تمہاری جیبوں سے ساہوکاروں کے خزانے میں جا رہا ہے اور کروڑوں روپے کی جائدادیں تمہارے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہیں۔ کیا اسلام نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ تم کو خود تمہاری بری عادتیں تباہ کر رہی ہیں۔ اس مفلسی کی حالت میں بھی سینما اور کھیل تماشے تمہاری آبادی

سے بھرے رہتے ہیں۔ تم میں کا ہر شخص لباس اور زینت و آرائش کے سامانوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ تمہاری جیبوں سے ہر مہینے لکھوکھا روپیہ بیہودہ رسموں اور نمائشی افعال اور جاہلانہ اشغال میں صرف ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کس کو اسلام نے تمہارے لیے حلال کیا تھا؟ سب سے بڑی چیز جس نے تم کو تباہ کر دیا ہے وہ ادائے زکوٰۃ میں غفلت اور آپس کی معاونت سے بے پروائی ہے۔ کیا اسلام نے یہ چیز تم پر فرض نہ کی تھی؟ پس حقیقت یہ ہے کہ تمہاری معیشت کی بربادی اسلامی قیود کی پابندی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان سے آزادی کا نتیجہ ہے۔ رہی ایک سود کی پابندی تو وہ بھی کہاں قائم ہے؟ کم از کم ۹۵ فیصدی مسلمان بغیر کسی حقیقی مجبوری کے سود پر قرض لیتے ہیں۔ کیا اسلامی احکام کی پابندی اسی کا نام ہے؟ مالدار مسلمانوں میں سے بھی ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں سود کھا ہی رہا ہے۔ باقاعدہ ساہوکاری نہ کی تو کیا ہوا، بینک اور بیمہ اور سرکاری بانڈس اور پراویڈنٹ فنڈس کا سود تو اکثر و بیشتر مالدار مسلمان کھاتے ہیں۔ پھر وہ حرمتِ سود کی قید کہاں ہے جس پر تم اپنی معاشی خستہ حالی کا الزام رکھتے ہو؟

عجیب پُرلطف استدلال ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور قومی طاقت کا مدار دولت مندی پر ہے، اور دولت کا مدار سود کے جواز پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہی خبر نہیں کہ عزت اور طاقت کا مدار دراصل ہے کس چیز پر۔ محض دولت ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معزز اور طاقت ور بناتی ہو۔ تمہارا ایک ایک شخص اگر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جائے مگر تم میں کیریکٹر کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ دنیا میں تمہاری کوئی عزت نہ ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر تم میں درحقیقت

اسلامی سیرت موجود ہو، تم صادق اور امین ہو، لالچ اور خوف سے پاک ہو، اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملات میں کھرے ہو، حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو، حرام و حلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو، اور تم میں اتنی اخلاقی قوت موجود ہو کہ کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو راستی سے نہ ہٹا سکے اور کسی قیمت پر تمہارا ایمان نہ خریدا جا سکے، تو دنیا میں تمہاری ساکھ قائم ہو جائے گی، دلوں میں تمہاری عزت بیٹھ جائے گی۔ تمہاری بات کا وزن لکھپتی کی پوری دولت سے زیادہ ہوگا، تم جھونپڑیوں میں رہ کر اور پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی دولت سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے اور تمہاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہوگی جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جا سکتا۔ عہد صحابہؓ کے مسلمان کس قدر مفلس تھے۔ جھونپڑیوں اور کمبل کے خیموں میں رہنے والے، تمدن کی شان و شوکت سے ناآشنا، نہ ان کے لباس درست، نہ غذا درست، نہ ہتھیار درست، نہ سواریاں شاندار۔ مگر ان کی جو دھاک اور ساکھ دنیا میں تھی وہ نہ اموی عہد میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی، نہ عباسی عہد میں اور نہ بعد کے کسی عہد میں۔ ان کے پاس دولت نہ تھی مگر کیریکٹر کی طاقت تھی جس نے دنیا میں اپنی عزت اور عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ بعد والوں کے پاس دولت آئی، حکومت آئی، تمدن کی شان و شوکت آئی۔ مگر کوئی چیز بھی کیریکٹر کی کمزوری کا بدل فراہم نہ کر سکی۔

تم نے تاریخ اسلام کا سبق تو فراموش ہی کر دیا ہے، مگر دنیا کی جس قوم کی تاریخ چاہو اٹھا کر دیکھ لو، تم کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کسی قوم نے محض سہولت پسندی اور آرام طلبی اور منفعت پرستی سے عزت اور طاقت حاصل کی

ہو تم کسی ایسی قوم کو معزز اور سربلند نہ پاؤ گے جو کسی اصول اور کسی ڈسپلن کی پابند نہ ہو، کسی بڑے مقصد کے لیے تنگی اور مشقت اور سختی برداشت نہ کر سکتی ہو، اور اپنے اصول و مقاصد کے لیے اپنے نفس کی خواہشات کو اور خود اپنے نفس کو بھی قربان کر دینے کا جذبہ نہ رکھتی ہو۔ یہ ڈسپلن اور اصول کی پابندی اور بڑے مقاصد کے لیے راحت و آسائش اور منافع کی قربانی کسی نہ کسی رنگ میں تم کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اسلام میں اس کا رنگ کچھ اور ہے اور دوسری ترقی یافتہ قوموں میں کچھ اور۔ یہاں سے نکل کر تم کسی اور نظام تمدن میں جاؤ گے تو وہاں بھی تم کو اس رنگ میں نہ سہی کسی دوسرے رنگ میں ایک نہ ایک ضابطہ کا پابند ہونا پڑے گا، ایک نہ ایک ڈسپلن کی گرفت برداشت کرنی ہوگی، چند مخصوص اصولوں کے شکنجے میں بہرحال تم جکڑے جاؤ گے، اور تم سے کسی مقصد اور کسی اصول کی خاطر قربانی کا مطالبہ ضرور کیا جائے گا۔ اگر اس کا حوصلہ تم میں نہیں ہے، اگر تم صرف نرمی اور کشادگی اور مٹھاس ہی کے متوالے ہو اور کسی سختی، کسی کڑواہٹ کو گوارا کرنے کی طاقت تم میں نہیں ہے تو اسلام کی قید و بند سے نکل کر جہاں چاہو جا کر دیکھ لو۔ کہیں تم کو عزت کا مقام نہ ملے گا۔ اور کسی جگہ طاقت کا خزانہ تم نہ پا سکو گے۔ قرآن نے اس قاعدۂ کلیہ کو صرف چار لفظوں میں بیان کیا ہے اور وہ چار لفظ ایسے ہیں جن کی صداقت پر پوری تاریخ عالم گواہ ہے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ یُسر کا دامن ہر حال میں عُسر کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس میں عُسر کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ کبھی یُسر سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۱۳۵۵ھ۔ مئی ۱۹۳۶ء)

مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل

"یہ وہ نوٹ ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مجلس اصلاح نصاب دینیات کے استفسارات کے جواب میں بھیجا گیا تھا، اگرچہ اس میں خطاب بظاہر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہے، لیکن دراصل اس کے مخاطب مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارات ہیں۔ جس تعلیمی پالیسی کی توضیح اس نوٹ میں کی گئی ہے، اسے اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے۔ علی گڑھ ہو یا دیوبند یا ندوہ یا جامعہ ملیہ، سب کا طریق کار اب زائد المیعاد ہو چکا ہے، اگر یہ اس پر نظر ثانی نہ کریں گے تو اپنی افادیت بالکل کھو دیں گے۔"

مسلم یونیورسٹی کورٹ اس امر پر تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے ادارہ کے بنیادی مقصد، یعنی طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی۔ اور اس کو روبعمل لانے کے لیے آپ کی مجلس کا تقرر کیا۔ اس سلسلہ میں جو کاغذات یونیورسٹی کے دفتر سے بھیجے گئے ہیں ان کو میں نے پورے غور و خوض کے ساتھ دیکھا۔ جہاں تک دینیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریق تعلیم کا تعلق ہے اس کے ناقابل اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو نصاب اس وقت پڑھایا جا رہا ہے وہ یقیناً ناقص ہے۔ لیکن مجلس کے معزز ارکان کی جانب سے جو سوالات مرتب کئے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس

وقت مجلس کے پیشِ نظر صرف ترمیم نصاب کا سوال ہے، اور غالباً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ چند کتابوں کو خارج کر کے چند دوسری کتابیں رکھ دینے سے طلبہ میں "اسلامی اسپرٹ" پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر میرا قیاس صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ یہ اصلی صورتِ حال کا بہت ہی نامکمل اندازہ ہے۔ دراصل ہم کو اس سے زیادہ گہرائی میں جا کر یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کی اس تعلیم کے باوجود جو اس وقت دی جا رہی ہے، طلبا میں "حقیقی اسلامی اسپرٹ" پیدا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر محض موجودہ نصابِ دینیات کا نقص ہی اس کی وجہ ہے تو اس نقص کو دور کرنا بلاشبہ اس خرابی کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں، اگر آپ کی پوری تعلیمی پالیسی میں کوئی اساسی خرابی موجود ہے تو اصلاحِ حال کے لیے محض نصاب دینیات کی ترمیم ہرگز کافی نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا۔ خواہ وہ کتنا ہی محنت طلب اور مشکلات سے لبریز ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے، اور جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انہیں امکانی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

میرا یہ بیان تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یونیورسٹی کی موجودہ تعلیمی پالیسی پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی اساسی خرابیوں کو واضح کیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ مسلمانوں کے حقیقی مفاد کے لیے اب ہماری تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ دوسرے حصہ میں اصلاحی تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اور تیسرے حصہ میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر سے بحث کی جائے گی

اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ وہ بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یکجائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متبائن اور متزاحم عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے، اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ قباحت کا سبب بن گئی ہے، کیونکہ اوّل تو خود آمیزش ہی درست نہیں ہے، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت طاقتور اور اسلامی عنصر اس کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے۔ مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر رفتارِ زمانہ کی قوت اور ایک عالمگیر حکمراں تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں ہے اور ہونا چاہیے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی

صاف اور سادہ لوحِ دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کی ذہنیت کلیتہً مغربی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں، اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور باوقعت ہے تو وہی ہے جو مغربی حکمت کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اس تربیت سے پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں عملاً دی جا رہی ہے۔ لباس، معاشرت، آداب و اطوار، رفتار و گفتار کھیل کود، غرض کونسی چیز ہے جس پر مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۰ فیصدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحبِ نظر خود سمجھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے۔ اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کھو کر ویسے ہی کمزور ہو چکا ہے۔ پھر ہماری یونیورسٹی میں اس کی تعلیم جن کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے وہ موجودہ زمانہ سے صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں۔ ان کی زبان اور ترتیب و تدوین ایسی نہیں جو عصری دماغوں کو اپیل کر سکے۔ ان میں اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن عملی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر اب درپیش نہیں ہیں، اور جو مسائل اب درپیش ہیں ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید براں اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت، کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبا کے دل و دماغ

پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آجاتے اور اسلامی عنصر محض ایک سامان منحکہ بننے کے لیے رہ جاتے، یا زیادہ سے زیادہ اس لیے کہ زمانہ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جاتے۔

میں اپنی صاف گوئی پر معافی کا خواستگار ہوں، مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس کو بے کم وکاست بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بحیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سر تاپا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں، تاکہ آپ پر اسے غیر مسلم بنانے کا الزام عائد نہ ہو، اور اگر وہ اس بستہ کو اٹھا کر پھینک دے (جس کی وجہ دراصل آپ ہی کی تعلیم ہو گی) تو وہ خود ہی اس فعل کے لیے قابل الزام قرار پاتے۔ اس طرز تعلیم سے اگر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان پیدا کرے گا تو یہ یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ معجزے اور خرقِ عادت کے متوقع ہیں۔ کیونکہ آپ نے جو اسباب مہیا کیے ہیں ان سے قانون طبیعی کے تحت تو یہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ فی صدی ایک یا دو چار طالب علموں کا مسلمان (کامل اعتقادی و عملی مسلمان) رہ جانا کوئی حجت نہیں۔ یہ آپ کی یونیورسٹی کے فیضان تربیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت ہے کہ جو اس فیضان سے اپنے ایمان و اسلام کو بچالے گیا وہ دراصل فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوا تھا۔ ایسے مستثنیات جس طرح علی گڑھ کے فارغ التحصیل اصحاب میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی سرکاری یونیورسٹیوں بلکہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے متخرجین میں بھی مل سکتے ہیں جن کے نصاب میں سرے سے کوئی اسلامی عنصر ہے ہی نہیں۔

اب اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہٖ باقی رکھیں اور محض دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور نصاب شریک کر دیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی۔ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا جس میں یہ دو طاقتیں پوری طاقت کے ساتھ جنگ کریں گی اور بالآخر آپ کے طلبا تین مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک وہ جن پر فرنگیت غالب رہے گی، عام اس سے کہ وہ انگریزیت کے رنگ میں ہو، یا ہندی وطن پرستی کے رنگ میں یا ملحدانہ اشتراکیت کے رنگ میں۔

دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب رہے گی، خواہ اس کا رنگ گہرا ہو یا فرنگیت کے اثر سے پھیکا پڑ جائے۔

تیسرے وہ جو نہ پورے مسلمان ہوں گے نہ پورے فرنگی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ نتیجہ بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں۔ نہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے اس اجتماع نقیضین کو مفید کہا جا سکتا ہے، اور نہ قومی نقطۂ نظر سے ایسی یونیورسٹی اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر سکتی ہے جس کے نتائج کا ۲/۳ حصہ قومی مفاد کے خلاف اور قومی تہذیب کے لیے نقصان کا مترادف ہو۔ کم از کم مسلمانوں کی غریب قوم کے لیے تو یہ سودا بہت ہی مہنگا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک ایسی ٹکسال جاری رکھے جس میں سے ۳۳ فیصدی سکے تو مستقل طور پر کھوٹے نکلتے رہیں، اور ۳۳ فیصدی ہمارے خرچ پر تیار ہو کر غیروں کی گود میں ڈال دیئے جائیں، بلکہ بالآخر خود ہمارے خلاف استعمال ہوں۔

مذکورہ بالا بیان سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں۔

اولاً تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔
ثانیاً اسلامی مفاد کے لیے بھی ایسی آمیزش کسی طرح مفید نہیں، خواہ وہ اس قسم کی غیر مساوی آمیزش ہو جیسی اب تک رہی ہے، یا مساوی کر دی جائے جیسا کہ اب کرنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔
ان امور کی توضیح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی اب کیا ہونی چاہیئے۔
یہ ظاہر ہے کہ ہر یونیورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درسگاہ میں دی گئی ہے، نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درسگاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کس کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہے اگر وہ مغربی کلچر ہے تو اس کو مسلم یونیورسٹی نہ کہیئے، نہ اس میں دینیات کا ایک نصاب رکھ کر خواہ مخواہ طالب علموں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کیجیے۔ اور اگر وہ اسلامی کلچر ہے تو آپ کو اپنی یونیورسٹی کی پوری ساخت بدلنی پڑے گی اور اس کی ہیئت ترکیبی کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ وہ بحیثیت مجموعی اس کلچر کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مناسب ہو، اور نہ صرف اس کا تحفظ کرے بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اچھی طاقت بن جائے۔
جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں، موجودہ حالت میں تو آپ کی یونیورسٹی اسلامی

کلچر کی نہیں بلکہ مغربی کلچر کی خادم بنی ہوتی ہے۔ اس حالت میں اگر صرف اتنا تغیر کیا جائے کہ دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقت ور کر دیا جائے اور تعلیم و تربیت کے باقی تمام شعبوں میں پوری مغربیت برقرار رہے تو اس سے بھی یہ درسگاہ اسلامی کلچر کی خادم نہیں بن سکتی۔ اسلام کی حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ دنیوی تعلیم و تربیت اور دینی تعلیم کو الگ کرنا اور ایک دوسرے سے مختلف رکھ کر ان دونوں کو یکجا جمع کر دینا بالکل لاحاصل ہے۔ اسلام مسیحیت کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس کا دین دنیا سے کوئی الگ چیز ہو۔ وہ دنیا کو دنیا والوں کے لیے چھوڑ کر صرف اعتقادات اور اخلاقیات کی حد تک اپنے دائرے کو محدود نہیں رکھتا۔ اس لیے مسیحی دینیات کی طرح اسلام کے دینیات کو دنیویات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لیے ایک ایسے طریقہ پر تیار کرنا ہے، جو اس زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک سلامتی، عزت اور برتری کا طریقہ ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی فکر و نظر کو درست کرتا ہے۔ اس کے اخلاق کو سنوارتا ہے، اس کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے لیے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے اور اس کو اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کر کے دیتا ہے۔ افراد کی ذہنی و عملی تربیت، سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور زندگی کے تمام شعبوں کی تربیت و تعدیل کے باب میں اس کے اصول و ضوابط سب سے الگ ہیں۔ انہی کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے، اور مسلمان قوم کا بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے۔ پس جب حال یہ ہے تو

اسلامی دینیات" کی اصلاح بھی بے معنی ہو جاتی ہے اگر زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا ربط باقی نہ رہے۔ اسلامی کلچر کے لیے وہ عالم دین بیکار ہے جو اسلام کے عقائد اور اصول سے واقف ہے مگر ان کو لے کر علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے دائم التغیر احوال و مسائل میں ان کو برتنا نہیں جانتا۔ اسی طرح اس کلچر کے لیے وہ عالم دین بھی بیکار ہے جو دل میں تو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے مگر دماغ سے غیر اسلامی طریق پر سوچتا ہے، معاملات کو غیر اسلامی نظر سے دیکھتا ہے اور زندگی کو غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے زوال اور اسلامی نظامِ تمدن کی ابتری کا اصلی سبب یہی ہے کہ ایک مدت سے ہماری قوم میں صرف انہی دو قسموں کے عالم پیدا ہو رہے ہیں، اور دنیوی علم و عمل سے علمِ دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو جائے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنے لگے، تو اس ٹوٹے ہوئے رابطہ کو پھر قائم کیجیے۔ مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ دینیات کے نصاب کو جسمِ تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنا دیا جائے۔ نہیں اس کو پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجیے کہ وہ اس کا دورانِ خون، اس کی روحِ رواں اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے، اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جزء بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی، مسلمان سائنسدان، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تہذیب حاضر

کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیبِ اسلامی کی خدمت لیں گے، اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانینِ حیات کو روحِ عصری کے لحاظ سے از سرِ نو مرتب کریں گے، یہاں تک کہ اسلام از سرِ نو علم و عمل کے ہر میدان میں اسی امامت و رہنمائی کے مقام پر آجائے گا جس کے لیے وہ در حقیقت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ تخیل جو مسلمانوں کی جدید تعلیمی پالیسی کا اساسی تخیل ہونا چاہیے۔ زمانہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکا ہے جہاں سرسید ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ اگر اب زیادہ عرصہ تک ہم اس پر قائم رہے تو بحیثیت ایک مسلم قوم کے ہمارا ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔

۲

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اوپر جس تعلیمی پالیسی کا ہیولیٰ میں نے پیش کیا ہے اس کو صورت کا لباس کس طرح پہنایا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلم یونیورسٹی کے حدود میں "فرنگیت" کا کلی استیصال کر دینا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی قومی تہذیب کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا نہیں چاہتے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی نئی نسلوں میں "فرنگیت" کے ان روز افزوں رجحانات کا سدِ باب کریں۔ یہ رجحانات دراصل غلامانہ ذہنیت اور چھپی ہوئی دناءت (Inferiority complex) کی پیداوار ہیں۔ پھر جب ان کا عملی ظہور، لباس، معاشرت، آداب و اطوار اور بحیثیت مجموعی پورے ماحول میں ہوتا ہے تو یہ ظاہر اور باطن دونوں طرف سے نفس کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور اس میں شرفِ قومی کا رتی برابر احساس نہیں چھوڑتے، ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے اصولوں

اور اپنے اساسی تصورات کے مجرد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے نشوونما پاتی ہے۔ اگر عملی برتاؤ مفقود ہو جاتے تو تہذیب اپنی طبیعی موت مر جاتے گی، اور اس کا ذہنی وجود بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ پس سب سے مقدم اصلاح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جاتے۔ آپ کی تربیت ایسی ہونی چاہیئے جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی قومی تہذیب پر فخر کرنا سکھاتے، ان میں اپنی قومی خصوصیات کا احترام بلکہ عشق پیدا کرے، ان میں اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کی روح پھونک دے، ان کو اس قابل بنا دے کر وہ اپنے علم اور اپنی تربیت یافتہ ذہنی صلاحیتوں سے اپنے قومی تمدن کو شائستگی کے بلند مدارج کی طرف لے چلیں۔

(۲) اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل پر ہے۔ جو معلم خود اس روح سے خالی ہیں، بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالف ہیں ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ آپ محض عمارت کا نقشہ بنا سکتے ہیں، مگر اصلی معمار آپ نہیں آپ کے تعلیمی اسٹاف کے ارکان ہیں۔ فرنگی معماروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز تعمیر پر عمارت بنائیں گے، کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید رکھنا ہے۔ محض دینیات کے لیے چند "مولوی" رکھ لینا ایسی صورت میں بالکل فضول ہوگا جب کہ دوسرے تمام یا اکثر علوم کے پڑھانے والے غیر مسلم یا ایسے مسلمان ہوں جن کے خیالات غیر اسلامی ہوں۔ کیونکہ وہ زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلبہ کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے، اور اس زہر کا تریاق محض دینیات کے کورس سے فراہم نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا

خواہ کوئی فن ہو، فلسفہ ہو یا سائنس، معاشیات ہو یا قانون، تاریخ ہو یا کوئی اور علم، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لیے کسی شخص کا محض ماہرِ فن ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہرِ فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیئے کہ ہماری یونیورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کلچر کے لیے خیالات اور اعمال دونوں کے لحاظ سے مفید ہوں۔

(۳) یونیورسٹی کی تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔ یہ ہماری کلچر کی زبان ہے۔ اسلام کے ماخذِ اصلیہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل نہ کرے گا، اسلام کی روح کو نہ پا سکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا۔ وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا، اور اس طرح آفتاب کی روشنی اس کو براہِ راست آفتاب سے کبھی نہ مل سکے گی بلکہ مختلف قسم کے رنگین آئینوں کے واسطے ہی سے ملتی رہے گی۔ آج ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلامی مسائل میں ایسی ایسی غلطیاں کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ قرآن اور سنت سے استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ آگے چل کر پراونشل اٹانومی کے دور میں جب ہندوستان کی مجالسِ مقننہ کو قانون سازی کے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہوں گے اور سوشل رفارم کے لیے نئے نئے قوانین بنائے جانے لگیں گے اس وقت اگر مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کرتے

رہے جو اسلام سے ناواقف ہوں اور اخلاق، معاشرت اور قانون کے مغربی تصورات پر اعتقاد رکھتے ہوں، تو جدید قانون سازی سے مسلمانوں میں سوشل ریفارم ہونے کے بجائے انٹی سوشل ڈیفارم ہو گی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے اصولوں سے اور زیادہ دُور ہوتا چلا جائے گا۔ پس عربی زبان کے مسئلہ کو محض ایک زبان کا مسئلہ نہ سمجھئے، بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ آپ کی یونیورسٹی کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے اور جو چیز اساسیات (Funadamentals) سے تعلق رکھتی ہو اس کے لیے سہولت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر حال میں اس کی جگہ نکالنی پڑتی ہے۔

(۴) ہائی اسکول کی تعلیم میں طلبہ کو حسب ذیل مضامین کی ابتدائی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔

الف۔ عقائد

اس مضمون میں عقائد کی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لیے نہایت لطیف انداز بیان اختیار کرنا چاہیئے جو فطری وجدان اور عقل کو اپیل کرنے والا ہو۔

طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کے ایمانیات دراصل کائنات کی بنیادی صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں ہماری زندگی سے ایک گہرا ربط رکھتی ہیں۔

ب۔ اسلامی اخلاق

اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات نہ پیش کئے جائیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور انبیاءؑ علیہ السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لے کر جمع

رکھے جائیں جن سے طلبہ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کیریکٹر کی خصوصیات کیا ہیں اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ج۔ احکام فقہ

اس مضمون میں حقوق اللہ اور حقوق العباد اور شخصی کردار کے متعلق اسلامی قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کیے جائیں جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ مگر اس قسم کے جزئیات اس میں نہ ہونے چاہئیں جیسے ہماری فقہ کی پرانی کتابوں میں آتے ہیں کہ مثلاً کنوئیں میں چوہا گر جاتے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔ ان چیزوں کے بجائے عبادات اور احکام کی معنویت، ان کی روح اور ان کے مصالح طلبہ کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ ان کو یہ بتانا چاہیئے اسلام تمہارے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کیا پروگرام بتاتا ہے اور یہ پروگرام کس طرح ایک صالح سوسائٹی کی تخلیق کرتا ہے۔

د۔ اسلامی تاریخ

یہ مضمون صرف سیرت رسولؐ اور دور صحابہؓ تک محدود رہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ طلبہ اپنے مذہب اور اپنی قومیت کی اصل سے واقف ہو جائیں اور ان کے دلوں میں اسلامی حمیت کا صحیح

احساس پیدا ہو۔

ب۔ عربیت — عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب سے ایک حد تک مناسبت پیدا کر دے۔

س۔ قرآن — صرف اتنی استعداد کہ لڑکے کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ سادہ آیتوں کو کسی حد تک سمجھ سکیں اور چند سورتیں بھی ان کو یاد ہوں۔

(۵) کالج کی تعلیم میں ایک نصاب عام ہونا چاہیئے جو تمام طلبہ کو پڑھایا جائے۔ اس نصاب میں حسب ذیل مضامین ہونے چاہئیں۔

الف۔ عربیت — انٹرمیڈیٹ میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو۔ بی اے میں پہنچ کر اس مضمون کو تعلیم قرآن کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔

ب۔ قرآن — انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کو فہم قرآن کے لیے مستعد کیا جائے۔ اس مرحلہ میں صرف چند مقدمات ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ قرآن کا محفوظ اور تاریخی حیثیت سے معتبر ترین کتاب ہونا۔ اس کا وحی الہی ہونا۔ تمام مذاہب کی اساسی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی فضیلت۔ اس کی بے نظیر انقلاب انگیز تعلیم۔ اس کے اثرات نہ صرف عرب پر بلکہ تمام دنیا کے افکار اور قوانین حیات پر۔ اس کا انداز بیان اور طرز استدلال اس کا حقیقی

مدعا۔

بی۔اے میں اصل قرآن کی تعلیم دی جائے۔ یہاں طرزِ تعلیم یہ ہونا چاہئے کہ طلبا خود قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں اور استاد ان کی مشکلات کو حل اور ان کے شبہات کو رفع کرتا جائے۔ اگر مفصل تفسیر اور جزئی بحثوں سے اجتناب ہو اور صرف مطالب کی توضیح پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں بآسانی پورا قرآن پڑھایا جا سکتا ہے۔

ج۔ تعلیمات اسلامی

اس مضمون میں طلبہ کو پورے نظام اسلامی سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے۔ ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر اس سوسائٹی کی زندگی کو وہ معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں کن اصولوں پر منظم کرتا ہے۔ اس کے اجتماعی نظام میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس ڈھنگ پر کی گئی ہے۔ حدود اللہ کیا ہیں۔ ان حدود کے اندر مسلمان کو کس حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اور ان حدود کے باہر قدم نکالنے سے نظام اسلامی پر کیا اثرات مترتب

ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور جامعیت کے ساتھ نصاب
میں لائے جائیں اور اس کو چار سال کے مدارج تعلیمی
پر ایک مناسبت کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

(۶) نصاب عام کے بعد علوم اسلامیہ کو تقسیم کر کے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی
تعلیم میں پھیلا دیجئے اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو
پیوست کیجئے۔ مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں، اور اسلام
کو ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں، بلکہ جواباً میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک
حقائق علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔
دشمنی دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ مغربیت اور اسلام میں ہے۔ اکثر علوم
میں اہل مغرب اپنے چند مخصوص اساسی تصورات، بنیادی مفروضات (Hypothesis)
نقطہ ہائے آغاز (Starting Points) اور زاویہ ہائے نظر رکھتے ہیں جو
بجائے خود ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں بلکہ محض ان کے اپنے وجدانیات ہیں۔
وہ حقائق علمیہ کو اپنے ان وجدانیات کے سانچہ میں ڈھال لیتے ہیں، اور اس سانچہ
کی مناسبت سے ان کو مرتب کر کے ایک مخصوص نظام بنا لیتے ہیں۔ اسلام کی دشمنی
دراصل انہی وجدانیات سے ہے۔ وہ حقائق کا دشمن نہیں بلکہ اس وجدانی سانچے
کا دشمن ہے جس میں ان حقائق کو ڈھالا اور مرتب کیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنا ایک مرکزی
تصور، ایک زاویۂ نظر، ایک نقطۂ آغاز فکر، ایک وجدانی سانچہ رکھتا ہے جو اپنی
اصل اور فطرت کے اعتبار سے مغربی سانچوں کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اب یہ
سمجھ لیجئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ضلالت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مغربی

علوم و فنون سے حقائق لیتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ مغرب ہی سے اس کا وجدانی سانچہ بھی لے لیتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علمی شعبوں میں آپ خود ہی تو اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلبا کے دماغوں میں مغرب کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں، ان کی نظر کا فوکس مغربی زاویہ نظر کے مطابق جماتے ہیں، مغربی مفروضات کو مسلمات بناتے ہیں۔ استدلال و استشہاد اور تحقیق و تفحص کے لیے صرف وہی ایک نقطہ آغاز ان کو دیتے ہیں جو اہل مغرب نے اختیار کیا ہے اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو اسی طرز پر مرتب کرکے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب نے ان کو مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد آپ چاہتے ہیں کہ تنہا دینیات کا شعبہ انھیں مسلمان بنادے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ وہ شعبہ دینیات کیا کرسکتا ہے جس میں مجرد تصورات ہوں۔ حقائق علمیہ اور مسائل حیات پر ان تصورات کا انطباق نہ ہو بلکہ طلبہ کے ذہن میں جملہ معلومات کی ترتیب ان تصورات کے بالکل برعکس ہو! یہی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ گمراہی کا سدِباب کرنا چاہتے ہیں تو اس سرچشمہ کے مصدر پر پہنچ کر اس کا رخ پھیر دیجیے اور تمام علمی شعبوں کو وہ نقطہ آغاز، وہ زاویہ نظر، وہ اساسی اصول دیجیے جو قرآن نے آپ کو دیتے ہیں۔ جب اس وجدانی سانچہ میں معلومات مرتب ہوں گی اور اس نظر سے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جاتے گا تب آپ کے طلبہ "مسلم طلبہ" بنیں گے اور آپ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ان میں اسلامی سپرٹ پیدا کی۔ ورنہ ایک شعبہ میں اسلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر اسلام رکھ دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ کے فارغ التحصیل طلبہ فلسفہ میں غیر مسلم، قانون میں غیر مسلم،

سائنس میں غیر مسلم، قانون میں غیر مسلم، سیاسیات میں غیر مسلم، فلسفہ تاریخ میں غیر مسلم، معاشیات میں غیر مسلم ہوں گے اور ان کا اسلام محض چند اعتقادات اور چند مذہبی مراسم کی حد تک محدود رہ جائے گا۔

(۷) بی۔ اے، ایچ اور ایم۔ اے کے امتحانات کو بند کر دیجئے۔ نہ ان کی کوئی ضرورت نہ فائدہ۔ جہاں تک علوم اسلامیہ کے مخصوص شعبوں کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک شعبے کو اسی کے مماثل علم کے مغربی شعبہ کے انتہائی کورس میں داخل کر دیجئے۔ مثلاً فلسفہ میں حکمت اسلامیہ اور اسلامی فلسفہ کی تاریخ اور فلسفیانہ افکار کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ۔ تاریخ میں تاریخ اسلام اور اسلامی فلسفہ تاریخ، قانون میں اسلامی قانون کے اصول اور فقہ کے وہ ابواب جو معاملات سے متعلق ہیں۔ معاشیات میں اسلامی معاشیات کے اصول اور فقہ کے وہ حصے جو معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ سیاسیات میں اسلام کے نظریات سیاسی اور اسلامی سیاسیات کے نشو و ارتقا کی تاریخ اور دنیا کے سیاسی افکار کی ترقی میں اسلام کا حصہ (وقس علیٰ ہذا)

(۸) اس کورس کے بعد علوم اسلامیہ میں ریسرچ کے لیے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیئے جو مغربی یونیورسٹیوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیق پر سند فضیلت (Doctrate) دیا کرے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مجتہدانہ طرز تحقیق کی تربیت پا کر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام دنیا کی نظری و فکری رہنمائی کے لئے مستعد ہوں۔

۳

حصہ دوم میں جس طرز تعلیم کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ بظاہر ناقابل عمل معلوم

ہوتا ہے لیکن میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ توجہ اور محنت اور صرفِ مال سے اس کو بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ آپ کسی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہی منزل کے آخری نشان تک نہیں پہنچ سکتے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی تکمیل کا پورا سامان پہلے سے آپ کے پاس موجود ہو۔ ابھی تو آپ کو صرف عمارت کی بنیاد رکھنی ہے، اور اس کا سامان اس وقت فراہم ہو سکتا ہے۔ موجودہ نسل میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس طرز تعمیر پر بنیادیں رکھ سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت سے جو نسل اٹھے گی وہ دیواریں اٹھانے کے قابل ہو گی۔ پھر تیسری نسل ایسی نکلے گی جس کے ہاتھوں یہ کام انشاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ جو درجۂ کمال کم از کم تین نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے، اس کو آج ہی حاصل کر لینا ممکن نہیں۔ لیکن تیسری نسل میں عمارت کی تکمیل تب ہی ہو سکے گی کہ آپ آج اس کی بنیاد رکھ دیں۔ ورنہ اگر اس کے درجۂ کمال کو اپنے سے دور پا کر آپ نے آج سے اس کی ابتدا ہی نہ کی۔ حالانکہ ابتدا کرنے کے اسباب آپ کے پاس موجود ہیں، تو یہ کام کبھی انجام نہ پا سکے گا۔

چونکہ میں اس اصلاحی اقدام کا مشورہ دے رہا ہوں اس لیے یہ بھی میرا فرض ہے کہ اس کو عمل میں لانے کی تدابیر بھی پیش کروں۔ اپنے بیان کے اس حصہ میں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرز تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے قابلِ عمل تدبیریں کیا ہیں۔

(۱) ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے عقائد، اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کا ایک جامع کورس حال ہی میں سرکار نظام کے محکمۂ تعلیمات نے تیار کرایا ہے اس کو ضروری

ترمیم و اصلاح سے بہت کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم قدیم طرز کی وجہ سے جس قدر بوجھل ہوگئی تھی الحمد للہ کہ اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ اس کے لیے جدید طریقے مصر و شام اور خود ہندوستان میں ایسے نکل آئے ہیں جن سے بآسانی یہ زبان سکھائی جا سکتی ہے۔ ایک خاص کمیٹی ان لوگوں کی مقرر کی جائے جو عربی تعلیم کے جدید طریقوں میں علمی و عملی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مشورے سے ایک ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں زیادہ تر قرآن ہی کو عربی کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ اس طرح تعلیم قرآن کے لیے الگ وقت نکالنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اور ابتدا ہی سے طلبہ کو قرآن سے مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی تاریخ کے بکثرت رسالے اُردو زبان میں لکھے جا چکے ہیں۔ ان کو جمع کر کے بنظر غور دیکھا جائے اور جو رسائل مفید پائے جائیں ان کو ابتدائی جماعتوں کے کورس میں داخل کر لیا جائے۔

مقدم الذکر دونوں مضامین کے لیے روزانہ صرف ایک گھنٹہ کافی ہوگا۔ رہی اسلامی تاریخ تو یہ مضمون کوئی الگ وقت نہیں چاہتا۔ تاریخ کے عمومی نصاب میں اس کو ضم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کوئی زیادہ تغیر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ تغیر کی ضرورت جو کچھ بھی ہے نصابِ تعلیم اور تعلیمی اسٹاف میں ہے۔ دینیات کی تدریس اور اس کے مدرس کا جو تصور آپ کے ذہن میں اب تک رہا ہے اس کو نکال دیجیے۔ اس دور کے لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنیت اور ان کے نفسیات کو سمجھنے والے مدرس رکھیے۔ ان کو ایک ترقی یافتہ نصابِ تعلیم دیجیے اور اس کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کیجیے جس میں "اسلامیت"

کے بیج کو بالیدگی نصیب ہو سکے۔

(۴) کالج کے لیے نصاب عام کی جو تجویز میں نے پیش کی ہے اس کے تین اجزا ہیں:-

(الف) عربیت (ب) قرآن (ج) تعلیمات اسلامی۔

ان میں سے عربیت کو آپ ثانوی لازمی زبان کی حیثیت دیجیے۔ دوسری زبانوں میں سے کسی کی تعلیم اگر طلبہ حاصل کرنا چاہیں تو ٹیوٹرس کے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کالج میں جو زبان ذریعہ تعلیم ہے، اس کے بعد صرف عربی زبان ہی لازمی ہونی چاہیے۔ اگر نصاب اچھا ہو اور پڑھانے والے آزمودہ کار ہوں تو انٹرمیڈیٹ کے دو سالوں میں طلبہ کے اندر اتنی استعداد پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ بی۔اے میں پہنچ کر قرآن کریم کی تعلیم خود قرآن کی زبان میں حاصل کر سکیں۔

قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے لیکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبا کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا۔ پھر بی۔اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

تعلیمات اسلامی کے لیے ایک جدید کتاب لکھوانے کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر حاوی ہو جن کی طرف میں نے حصہ دوم کے نمبرہ (ضمن ج) میں اشارہ کیا ہے کچھ نہ ہو۔ بد اگر میں نے خود ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب "اسلامی تہذیب

اور اس کے "اصول و مبادی" کے عنوان سے لکھنی شروع کی تھی جس کے ابتدائی تین باب "ترجمان القرآن" میں محرم ۱۳۵۸ھ سے شعبان ۱۳۵۸ھ تک کے پرچوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ اگر اس کو مفید سمجھا جائے تو میں اس کی تکمیل کر کے یونیورسٹی کی نذر کر دوں گا۔

ان مضامین کے لیے کالج کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کسی تغیر کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ عربیت کے لیے وہی وقت کافی ہے جو آپ کے ہاں ثانوی زبان کے لیے ہے۔ قرآن اور تعلیمات اسلامیہ دونوں کے لیے باری باری سے وہی وقت کافی ہو سکتا ہے جو آپ کے ہاں دینیات کے لیے مقرر ہے۔

(۳) زیادہ تر مشکل اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آئے گی جسے میں نے حصّہ دوم کے نمبر ۶، ۷ میں پیش کیا ہے۔ اس کے حل کی تین صورتیں ہیں جن کو بتدریج اختیار کیا جا سکتا ہے:۔

(الف) ایسے پروفیسر تلاش کیے جائیں (اور وہ ناپید نہیں ہیں) جو علوم جدیدہ کے ماہر ہونے کے ساتھ قرآن اور سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں، جن میں اتنی اہلیت ہو کہ مغربی علوم کے حقائق کو ان کے نظریات اور ان کی وجدانی اساس سے الگ کر کے اسلامی اصول و نظریات کے مطابق مرتب کر سکیں۔

(ب) اسلامی فلسفۂ قانون، اصول قانون و فلسفۂ تشریع، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ و فلسفۂ تاریخ وغیرہ کے متعلق عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اس کی چھان بین کی جائے۔ جو کتابیں بعینہٖ لینے کے قابل ہوں ان کا انتخاب کر لیا جائے اور جن کو اقتباس یا حذف و ترمیم کے ساتھ کار آمد بنایا جا سکتا ہو ان کو اسی طریق پر کام میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے اہل علم

کی ایک خاص جمعیت مقرر کرنی ہوگی۔

(ج) چند ایسے فضلاء کی خدمات حاصل کی جائیں جو مذکورہ بالا علوم پر جدید کتابیں تالیف کریں۔ خصوصیت کے ساتھ اصول فقہ، احکام فقہ، اسلامی معاشیات، اسلام کے اصولِ عمران، اور حکمت قرآنیہ پر جدید کتابیں لکھنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ قدیم کتابیں اب درس و تدریس کے لیے کارآمد نہیں ہیں، ارباب اجتہاد کے لیے تو بلاشبہ ان میں بہت اچھا سواد مل سکتا ہے مگر ان کو جوں کا توں سبق کر موجودہ زمانے کے طلبہ کو پڑھانا بالکل بے سود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سردست ان تینوں تدبیروں سے وہ مقصد بدرجۂ کمال حاصل نہ ہوگا جو ہمارے پیش نظر ہے۔ بلاشبہ اس تعمیر جدید میں بہت کچھ نقائص پائے جائیں گے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا۔ اس میں جو کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کو بعد کی نسلیں پورا کریں گی یہاں تک کہ اس کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس سال بعد ظاہر ہوں گے۔

(۴) اسلامی ریسرچ کا شعبہ قائم کرنے کا ابھی موقع نہیں۔ اس کی نوبت چند سال بعد آئے گی۔ اس لیے اس کے متعلق تجاویز پیش کرنا قبل از وقت ہے۔

(۵) میری تجاویز میں فرقی اختلافات کی گنجائش بہت کم ہے۔ تاہم اس باب میں علمائے شیعہ سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ کس حد تک اس طرز تعلیم میں شیعہ طلبہ کو سنی طلبہ کے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔ اگر وہ چاہیں تو شیعہ طلبا کے لیے خود کوئی اسکیم مرتب کریں، مگر مناسب یہ ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم میں فروعی اختلافات کو کم سے کم جگہ دی جائے اور مختلف فرقوں کی آئندہ نسلوں کو اسلام کے مشترک

اصول و مبادی کے تحت ترتیب کیا جاتے۔

(۶) سر محمد یعقوب کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ وقتاً فوقتاً علماء و فضلاء کو اہم مسائل پر لیکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ علی گڑھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیا ئے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ اکابر ہندوستان کے علاوہ مصر، شام، ایران، ٹرکی اور یورپ کے مسلمان فضلاء کو بھی دعوت دیجئے کہ یہاں آکر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج تحقیق سے ہمارے طلبہ میں روشنی فکر اور روحِ حیات پیدا کریں۔ اس قسم کے خطبات کافی معاوضہ دے کر لکھواتے جانے چاہئیں تاکہ وہ کافی وقت محنت اور غور و فکر کے ساتھ لکھے جائیں اور ان کی اشاعت نہ صرف یونیورسٹی کے طلبا کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک کے لیے بھی مفید ہو۔

(۷) اسلامی تعلیم کے لیے کسی ایک زبان کو مخصوص کرنا درست نہیں۔ اُردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس وقت نصاب کے لیے کافی سامان موجود نہیں ہے۔ لہٰذا سر دست ان میں سے جس زبان میں بھی جو مفید چیز مل جاتے اسی کو اسی زبان میں پڑھانا چاہیئے۔ دینیات اور علوم اسلامیہ کے معلمین سب کے سب ایسے ہونے چاہئیں جو انگریزی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ اب کوئی یک رُخا آدمی صحیح معلم دینیات نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے اس بیان کی اس طوالت پر عذر خواہ ہوں، مگر اتنی تطویل و تفصیل میرے لیے ناگزیر تھی، کیونکہ میں بالکل ایک نئے راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کرنے

پڑ رہے ہیں۔ میں حتماً اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی اب کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جاسکے اور وہ انقلاب ان خطوط پر ہو جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی موجود ہے، اور خود علی گڑھ میں ان کی کمی نہیں، جو میرے ان خیالات کو ایک دیوانے کا خواب کہیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ پیچھے دیکھنے والوں نے آگے دیکھنے والوں کو اکثر دیوانہ ہی سمجھا ہے۔ اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن جو کچھ میں آج دیکھ رہا ہوں، چند سال بعد شاید میری زندگی ہی میں وہ اس کو بچشم سر دیکھیں گے اور ان کو اس وقت اصلاح حال کی ضرورت محسوس ہوگی جب طوفان سر پر ہوگا اور تلافی مافات کے مواقع کم تر رہ جائیں گے۔

(ترجمان القرآن جمادی الاخری ۱۳۵۵ھ دسمبر ۱۹۳۶ء)

مرض اور اس کا علاج

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند "مذہبی" اعمال اور رسوم کا مجموعہ ہے، بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے اجزا کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں، آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں، معدہ اور جگر نکال دیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کر دیں، دماغ بھی پورا یا کچھ کم و بیش کاسۂ سر سے خارج کر دیں اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں۔ کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکے گا؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟

ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریقِ فکر (Attitude of mind)، مقصدِ زندگی (View of Life)، نظریۂ حیات اور معیارِ قدر (Standard of Values) جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح اور قوائم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظمِ اجتماعی کے

تمام وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کئے ہیں وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال و ظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے۔ اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کما حقۂ اظہار کر سکے۔ اس کو پاک صاف فضا کی حاجت ہے جس میں وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب و طاہر غذا مطلوب ہے جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔

اس پورے نظام میں اگرچہ قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء و جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے جب اکثر و بیشتر اعضا کٹ جائیں۔ جسم سے خارج کر دیئے جائیں یا خراب ہو جائیں۔ تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کچھے خستہ و بیمار اعضا کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے! اور اگر زندہ بھی ہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانین اسلامی قریب قریب معطل ہیں، اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصول اسلامی کا نفاذ پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت، اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر زاویۂ نظر بدل گیا ہے، کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ

ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے ہیں۔ عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ۶۰ فیصدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فیصدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیونکہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کتنے ہی اعضا کٹ گئے، کتنے مفلوج ہو گئے، کتنے موجود ہیں مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قلب باقی ہے، اور وہ بیمار ہو رہا ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی تو ان سے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے۔ مگر کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلہ میں جن کا سیلاب روزافزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے اپنے بقیہ اعضا کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اسی کا نتیجہ ہے کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اور اس کے اطراف واکناف میں کہیں بھی نظام اسلامی اپنی پوری مشینری کے

ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور سمجھتے ہیں کہ بس اسلام یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، بہت سے ایسے ہیں کہ مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرین اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں، مگر چونکہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں تاکہ جب عام بلوی شروع ہو جائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ یہ تو مردہ جسے تم لیے بیٹھے ہو، نہ خود تمہیں کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ان فوائد ہی سے متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ شُدھ کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیے، باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ لوگ خود دھوکے میں ہیں یا دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے جس کو یہ لوگ بھول گئے ہیں یا بھلا رہے ہیں کہ تمام معاملات زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہو جانے کے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل قطعاً بے زور ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ

عمل جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو۔ جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثارِ قدیمہ سے بے فائدہ و بے ضرورت دلچسپی کب تک باقی رہ سکے گی؟ نئے نظامِ زندگی میں جو بچہ پرورش پا کر جوان ہو گا وہ پوچھے گا کہ چند لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ میں کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس پر ایمان رکھوں جس کے سارے احکام اب بیکار ہو چکے ہیں؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو انسان گزر چکا ہے آج اس کو میں کس لیے خدا کا رسول مانوں؟ جب اس زندگی میں وہ میری رہنمائی ہی نہیں کرتا تو محض اس کی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظامِ حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں اس میں نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے، روزہ رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا رابطہ ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے ہے؟

یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا اور جب یہ علیحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائے گی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔ جس طرح نظامِ جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بےکار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ان دونوں میں ایک زندہ نظامِ جسمانی کے اعضا کا تعلق ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے۔ غیر اسلامی زندگی میں

اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست دپا۔

یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک مختصر گروہ پر ہی مترتب ہو رہا ہے۔ نہیں آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں اس کی محبت اور عزت موجود ہے، خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے، ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبعی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں سے حصہ مل رہا ہے۔ اور ہمارے علماء و مشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرہ میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ۱۵ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صرف اسلام کا نام باقی ہے جس سے ان کو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ اس طرح جان دے رہے ہیں اور نہ عملی حیثیت سے کوئی ایسا نظام زندگی موجود ہے جو انہیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ہر گمراہ کرنے والا ان کے عقائد اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ بس انہیں یہ اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جارہی ہے یہی عین ہدایت ہے یا کم از کم اسلام کے مخالف نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انہیں بھٹکا لے جا

سکتے ہیں، خواہ وہ قادیانیت کا راستہ ہو یا اشتراکیت کا، یا قسطائیت کا۔ ان کے روز افزوں افلاس اور ان کی ہولناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیتے ہیں ان کو موجودہ بے نظمی کی حالت میں اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔

مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھائے جو عام لوگوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں، ان کے اندر خود غرضی حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں، ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انہیں دولت میں حصہ دلوانے کا لالچ دلائیں، خوشحال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں، اور اس طرح ملک کے سواد اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑپتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا

سب سے زیادہ نازک حصّہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔ پھر جب بے چارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی اُمید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل چیز روٹی ہے، وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے:۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے، اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں"۔

یہ ابتدائی سبق ہے مذہب اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بیچارے جاہل و مفلس مسلمانوں کو دیا جاتا ہے اسی آن انہیں اس امر کا اطمینان بھی دلایا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے:۔

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے"۔

لے یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کئے گئے ہیں ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو ایک کثیر الاشاعت مسلم اخبار کے کالموں میں شائع ہوا ہے۔

گزشتہ ۲۰ سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانانِ روس کی نوخیز
نسلوں پر مترتب ہوتے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل
مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آرہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو
خاکستر کر دینے کے لیے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک سرچشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک
سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گزار دیے گئے تو یہ
اتنا بڑا سیلاب بن جائے گا کہ اس کے مقابلہ میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لاحاصل
ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد
میں بھی شائع کر دیے جائیں تو یہ حالات روبراہ نہیں آسکتے۔ محض زبان اور قلم سے
اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں
کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا جائے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں
میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے، سارے مسائل خود بخود حل نہیں ہو جائیں گے۔
اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کشمکش
اور جدوجہد کی دنیا ہے، اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اس کو پلٹنے
کے لیے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے۔ اگر اشتراکی اپنے غلط اصولوں کو لیکر نصف
صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ اگر فاشیت
اپنے غیر معتدل طریقوں کو لے کر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتی ہے۔ اگر گاندھی کی اہنسا ایک
غیر فطری چیز ہونے کے باوجود محض جدوجہد کے بل پر فروغ پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں
کہ مسلمان جن کے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں، ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا

سکہ نہ جما سکیں۔ مگر یہ سکہ زرے وعظ و تلقین سے نہیں جم سکتا۔ اس کے لیے سعی و عمل کی ضرورت ہے اور انہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنت اللہ کے مطابق دنیا میں سکہ جما کرتا ہے۔

"انقلاب انگیز جدوجہد" ایک مبہم لفظ ہے۔ اس کی عملی صورتیں بہت سی ہیں اور بہت سی ہو سکتی ہیں۔ جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو اس کے لیے وہی صورت اختیار کرنی پڑے گی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان نے (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی مرتبہ یہ انقلاب برپا کیا تھا وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا، اور اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے، مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے۔ وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقتور شخصیت وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لا سکتا ہے؟ اس لیے اب کوئی انسان اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کہاں برپا کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ لیکن اس انسان اکبر نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی خاصہ وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آ چکی ہے۔ اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی، اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنے ہی زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونہ کی طاقت سے

برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے۔ اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی، ہندوستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اسی اسوہ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "ادارہ دارالاسلام"[1] کا تخیل اسی اسوہ پاک کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

آنحضرتؐ جب مبعوث ہوتے تو روئے زمین پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا۔ آپؐ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اگرچہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے، اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر چونکہ متفرق تھے، کفار کے درمیان گھرے ہوتے تھے۔ بے بس اور کمزور تھے اس لیے اپنے ماحول سے لڑتے لڑتے ان کے بازو شل ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جن کو بدلنے کے لیے وہ اور ان کے ہادی و مرشد فداہ امی وابی کوشش فرما رہے تھے۔ ۱۲ سال تک حضور اسی طرح

---

[1] یہ ادارہ ۱۹۳۸ء میں قائم کیا گیا تھا۔ پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی یہ ادارہ اس میں ضم کر دیا گیا۔

جدوجہد کرتے رہے اور اس مدت میں سرفروش اہل ایمان کی ایک مٹھی بھر جماعت آپ نے فراہم کر لی، اس کے بعد اللہ نے دوسری تدبیر کی طرف آپ کی ہدایت فرمائی اور وہ یہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لے کر کفر کے ماحول سے نکل جائیں، ایک جگہ ان کو جمع کر کے اسلامی ماحول پیدا کریں، اسلام کا ایک گھر بنائیں جہاں اسلامی زندگی کا پورا پروگرام نافذ ہو، ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو، ایک ایسا پاور ہاؤس بنادیں جس میں تمام برقی طاقت ایک جگہ جمع ہو جائے اور پھر ایک منضبط طریقہ سے وہ پھیلنی شروع ہو۔ یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپؐ کی ہجرت اسی غرض کے لیے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے، ان سب کو حکم دیا گیا کہ سمٹ کر اس مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کر کے بتایا گیا۔ اس پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً) اتنا گہرا رنگ چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھائیں۔ ان میں کیرکٹر کی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور جو ان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں۔ ان کو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی

کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن و سنت نے انہیں دیا ہے اور ہر قسم
کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جزء گہرے مطالعہ اور غور و فکر کا مستحق
ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں اور جن
میں یہ استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام بہترین طریقہ پر سمجھا سکیں۔
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ (التوبہ۔۱۲۲)

(۲) کچھ لوگ ایسے تیار کئے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظام عمل کو قائم کرنے
اور پھیلانے کی سعی و جہد کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسب معیشت
سے بے نیاز کر دے لیکن خود انہیں اس کی پرواہ نہ ہو، چاہے معیشت کا کوئی انتظام
ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور رہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت
کر کے اس کام میں لگے رہیں جو ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے۔ وَلْتَكُن
مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران ۱۰۴)

(۳) پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر ہر شخص اعلائے کلمۃ اللہ کو
اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے مگر ہر کام میں یہ
مقصد اس کے سامنے ہو۔ تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صناع
اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ
اس بات کو پیش نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کے لیے ہیں اور جینا اس کام کے لیے

ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے، اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کرے اور جہاں دینوی فوائد میں اور اصول اسلام میں نقیض واقع ہو جاتے وہاں فوائد پر لات مار دے اور اصول کو ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے۔ اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں۔
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰)

(۴) باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دارالاسلام میں آئیں اور ایسے ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہو۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے۔ وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ (التوبہ ۶)

اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی و رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ دیکھتے دیکھتے اس نے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی۔ حتی کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد جب نظام اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہو گئی

تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقہ کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر بگڑ گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور آجاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو اور صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے۔ مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونہ کی ایک نقل تھی جسے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیائے کرام جن لوگوں میں استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انہیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشدِ اعظم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیار کیا کرتے تھے۔

اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ان کو پھر اسی طریقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہم ہندوستان سے نکل کر کہیں آزاد فضا نہیں پا سکتے جہاں مدینہ طیبہ کی طرح "دارالاسلام" بنایا جا سکے تو کم از کم ہم کو اسی ملک میں ایسی تربیت گاہیں بنانی چاہئیں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکے۔ جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گرد و پیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔ جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کی اجازت دی ہے یا اس کا حکم دیا ہے، اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اسے ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول یہ غیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے۔ جہاں ہم کو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی اثرات میں سے جن کو ہم روحِ اسلامی کے موافق پائیں صرف انہی

کو داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کو اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل وجان میں نفوذ کرنے سے روک سکیں۔ جہاں ہم کو ایسی فضا میسر آسکے کہ مسلمان کی طرح سوچ سکیں، مسلمان کی سی نظر اپنے اندر پیدا کر سکیں، ان اسلامی صفات کو نشو ونما دے سکیں جو اس دارالکفر کی مسموم آب وہوا میں فنا ہوتی چلی جا رہی ہیں، ان گندگیوں اور آلائشوں سے اپنی زندگی کو پاک کر سکیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشو ونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار اور اعمال میں گھس گئی ہیں، جن کا شعور تک بسا اوقات ہمیں نہیں ہوتا اور جن کو اگر ہم محسوس کر بھی لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو ان سے نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کی تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کے لیے تیار ہو جائیں۔ وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کا نقشہ تھا۔ اسی طرح کام کو شعبوں میں تقسیم کیا جائے، اور اسی طرح ہر شعبہ میں آدمیت کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کی جائے۔

(۱) ایک شعبہ ایسا ہو کہ جس میں اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انہیں مغربی زبانوں سے اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے، اور جن حضرات نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہو انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے۔ پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کر کے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان کے مختلف گروپ بنا دیئے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبہ علم کو لے کر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے، زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصولِ اسلام

کے مطابق ان کا حل تلاش کرے، علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہو گیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سرِ نو مدون کرے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمتِ اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دھن کے پکے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ جو ایک زبردست انقلابی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں، جن کی زندگی سادہ ہو، جن میں جفاکشی ہو، جن میں پورا ضبط و نظم پایا جائے، اور جن کی عملی سیرت ٹھیٹھ مسلمان کی سی ہو۔ یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (Social order) اور ایک نئی تہذیب (Civilisation) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے تاکہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جا سکے۔

(۳) تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں۔ انہیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں۔ دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں۔ اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں۔ ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے

ہو۔ پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور ان لوگوں کو ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار رہیں جو شعبہ نمبر ۲ کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں شریک بھی رہیں۔ اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

(۴) چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آکر کچھ علمی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کا گہرا نقش لے کر واپس جائیں۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ضروری مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسول و اصحاب کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلف صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی

ہم پہنیں، جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں، جیسا طرزِ معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدّن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (Foscilised) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں، اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بناتے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقا کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے، جو تغیر و ارتقا کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا مشن یہی ہے ہم کو "خیر امت" جو بنایا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم ارتقا کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Rear Guard) کی حیثیت سے لگے رہیں، بلکہ ہمارا

کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارے خیر امت ہونے کا راز اُخرِجَتۡ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے، یہ ہے کہ انہوں نے قوانین طبیعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب کی روح پھونکی۔ اس وقت جتنی طبیعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی ان سب کو انہوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا، اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل تمدن نے فراہم کیے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار و مشرکین سے سبقت لے گئے تاکہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب کے مقابلہ میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی کہ وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے بلکہ اس کا اصلی حقدار مسلم ہی ہے۔ پس نبیؐ و اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقا اور قوانین طبیعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوتے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجاتے خود ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ذاترکٹر کو دار وغہ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔ ہوائی جہاز ناپاک نہیں ہے، ناپاک وہ تہذیب

ہے جو ہوا کے فرشتے سے خدائی قانون کے بجائے شیطانی اغوا کے تحت خدمت لیتی ہے۔ سنیما ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے۔ آجکل کی ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی تمام ان طاقتوں سے کام لیا جا رہا ہے جو اس وقت تک انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو الٰہی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انہی طاقتوں سے کام لینا چاہیے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہو گا، خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی۔ کیونکہ اس عالمِ اسباب میں خدا کی جو سنت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔

اس تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک جسے میں پیش کر رہا ہوں نہ تو کوئی ارتجاعی (Reactionary) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیشِ نظر صرف مادی ارتقا ہو۔ میرے پیشِ نظر جو تربیت گاہ ہے اس کے لیے گروکل کانگڑی، ستیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے، اور اسی طرح جس انقلابی پارٹی کا تصور میرے ذہن میں ہے اس کے لیے اٹلی کی فاشسٹ اور جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی میں بھی کوئی نمونہ نہیں ہے۔

اس کے لیے اگر کوئی نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول اور اس حزب اللہ میں ہے جسے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کیا تھا۔

(ترجمان القرآن، شوال ۶۰ھ۔ دسمبر ۴۱ء)